قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتّرواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

طلوعِ اسلام کے قارئین کو جشن آزادی مبارک

جلد 68 شمارہ نمبر 08 اگست 2015ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	سلیم اختر	4
پرویز صاحب کا نظریہ اجتہاد (فقہ) قسط ششم	ملک منظور حسین لیل	6
قرآنی معاشرہ	عمر احمد عثمانی	21
درود شریف کا عملی مفہوم اور اس کے ثمرات	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	31
سوچنے کا فریم ورک قرآن کی نظر میں	یاسر پیرزادہ	36
کیا رویت ہلال کمیٹی کو ختم کر دینا چاہیے؟	ڈاکٹر محمد اجمل نیازی	39
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	42

ENGLISH SECTION

Surah *'Abasa*(عبس) – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 30: Chapter 9 Translated by: Dr. Mansoor Alam 48

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون 40 روپے فی پرچہ

پاکستان -/450 روپے سالانہ

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ نمبر 2، لاہور ۔ 54660، (پاکستان)

فون: 042-35714546

E-mail: idarati@gmail.com

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

سلیم اختر

لمعات

نظامِ پاکستان کے متعلق

علامہ اقبالؒ کا خط قائداعظمؒ کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے۔ حصول پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہئے۔ 14 اگست کے حوالہ سے وہ خط یاددہانی کے لیے ایک دفعہ پھر خدمت عالی میں پیش کیا گیا جا رہا ہے:۔

''لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لیے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئین جدید (یعنی 1935ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے وقف ہوجائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دوسو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔۔۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے

افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (Devolopment) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کردیا جائے تو اس سے کم ازکم ہر فرد کو سامانِ پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کرلیا تو ہندومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کرلینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرداف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کررہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔''

دیکھا آپ نے قارئین کرام! اِس خط میں مسلمانوں کے جو حالات تحریر کئے گئے ہیں 78 سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود جوں کے توں ہیں بلکہ زیادہ ابتر ہوئے ہیں۔ کیا ''جحیم'' اس کیفیت کا نام نہیں ہے؟ اِس خط میں جو تجویز پیش کی گئی ہے آج بھی وہی ہمارے درد کا درمان بن سکتی ہے۔ یعنی ایک فلاحی مملکت جس کا آئین قرآن کریم کے اصولوں پر مبنی ہو۔

؎ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

★★★★

خواجہ ازہر عباس کی زیرادارت درج ذیل کتابیں شائع ہوکر مارکیٹ میں دستیاب ہیں
(1) قرآن فہمی کے قرآنی قوانین، قیمت 200 روپے (2) اعجاز القرآن قیمت 200 روپے

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط ششم

پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ)

(قانون سازی)

قانون سازی کا اہم ترین کام، ہر دور میں، بدلتے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر، قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے، پوری امت کی مشاورت سے جاری رہے گا۔ مشاورت کا طریقہء کار بھی پوری امت کی مشاورت سے وضع اور طے کیا جائے گا۔ انفرادی یا اجتماعی (گروہی) تدبر و تحقیق کو صرف تجاویز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ قانون سازی کا اختیار کسی ایک فرد، گروہ، جماعت پارٹی یا فرقہ کو حاصل نہیں، یہ پوری امت (یعنی اسلامی مملکت) کا کام ہے۔

فقہ کی صحیح پوزیشن:۔ طلوع اسلام ستمبر ۱۹۸۰ء۔ ص۔ ۳۷۔ ''فقہ کی صحیح پوزیشن سمجھنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں قرآن مجید کا موقف کیا ہے۔ قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے ضابطہء زندگی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی ضروریات اور تقاضے جامد نہیں رہتے۔ یہ حالات اور زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جس ضابطہ کو عالمگیر انسانیت کے لئے، تمام زمانوں کے لئے ابدی راہنمائی کا کام دینا ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ اس میں نوعِ انسان کے لئے بدلتے رہنے والے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تبدیلی کی گنجائش ہوتی۔ اس بنیادی تقاضا کے پیشِ نظر، قرآن مجید نے بجز چند متعین احکام، زندگی کے لئے اصول اور اقدار دیئے ہیں۔ احکام و قوانین کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کر دیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ اصول اور اقدار ان حدود کا کام دیں گی جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔ قرآن مجید کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے مدوّن کردہ جزئیات، بدلتے رہنے والے حالات کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے اس حسین امتزاج سے، قرآنی نظام، نوعِ انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس نظام کی اس خصوصیت کو سمجھنے کے لئے (مثال کے طور پر) ہاکی

کے میدان کو سامنے لائیے۔ اس میدان کے چاروں طرف ایک نمایاں لکیر کھینچ کر اسے محدود کر دیا جاتا ہے۔ میدان کے اندر، دو چار جگہ خصوصی نشانات لگا دیئے جاتے ہیں اور دونوں ٹیموں کے لئے گول (نصب العین) متعین کر دیا جاتا ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، اور ان ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے جو اس کھیل کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، ٹیم اور ٹیم کا ہر کھلاڑی آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق، گیند کو گول کے اندر پہنچا دے۔ ان کھلاڑیوں میں سے جو شخص کھیل کے قواعد و ضوابط سے اچھی طرح واقف اور اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کے مزاج اور صلاحیتوں پر نگاہ رکھتا ہو، اسے ٹیم کا کپتان مقرر کر دیا جاتا ہے۔ یہ کپتان بھی ان قواعد و ضوابط کا باقی کھلاڑیوں کی طرح پابند ہوتا ہے۔ اس کا فریضہ کھلاڑیوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا ہوتا ہے۔۔ اس مثال سے اسلام کے نظامِ قانون سازی کا اصول سمجھ میں آجائے گا۔ ہر دور کی اسلامی مملکت کا فریضہ یہ طے کرنا ہوگا کہ قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو کس طریق سے نافذ کیا جائے۔ اس طریق کار یا پروگرام کی جزئیات کو احکامِ شریعت یا فقہی قوانین کہا جاتا ہے۔ (ضمناً) لفظ شریعت کے معنی اس راستے کے ہیں جو بہتے پانی کے گھاٹ کی طرف لے جائے۔ اس میں آبِ رواں یا بہتے پانی (ندی) کی شرط غور طلب ہے۔ پانی اگر کسی مقام پر ساکن یا جامد ہو جائے تو وہ ندی نہیں رہتی اس لئے اس قسم کے ساکن پانی (ناقابلِ تغیر قوانین) کی طرف لے جانے والے راستے کو ''شریعت'' کہا ہی نہیں جا سکے گا۔ باقی رہی فقہ، سو اس کے معنی ہیں غور و تفکر کے بعد کسی حل پر پہنچنا۔ اگر فقہ میں تفقہ (غور و فکر) کی گنجائش نہ رہے تو وہ فقہ کہلا ہی نہیں سکتی۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ، کسی زمانے کے مدون کردہ قوانین فقہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار نہیں پا سکتے۔ یہ اس زمانے کے لئے جس میں یہ مدوّن ہوئے تھے، قوانینِ شریعت کہلا سکتے تھے۔ انہیں بعد کے زمانے والوں پر علیٰ حالہٖ مسلط کرنا، نہ اسلام کا منشاء تھا، نہ ان مقننین کا مقصد جنہوں نے انہیں مدوّن کیا تھا۔ چونکہ یہ بعد کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر ہی نہیں سکتے، اس لئے ناممکن العمل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے غیر متبدل صرف کلمٰت اللہ (قوانینِ خداوندی) کو قرار دیا ہے (۶/۱۱۶)۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دینا، انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرک ہے۔ ابدیت اسی کے احکام کو حاصل ہو سکتی ہے جو خود ابدی ہو۔''

احکامِ شریعت:۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۳ء۔ ص۔ ۷:۔ ''اسلامی مملکت میں قرآن کے اصول و اقدار غیر متبدل ہوں گے۔ ان میں نہ تغیر و تبدل ہوگا، نہ حک و اضافہ۔ مملکت کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصول و اقدار و احکام کو نافذ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟۔ اس کا فیصلہ امت کی منتخب کردہ مجلسِ مشاورت (اسے آج کی اصطلاح میں پارلیمان کہہ لیجئے) کرے گی۔ اس کے لئے اُن اٹھارہ علوم کی قطعاً ضرورت نہیں ہوگی جنہیں حاصل کرنے کے بعد بیچارہ طالب علم نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔ دین کا اس لئے کہ ان کے نصاب میں قرآن محض تبرکاً شامل ہوتا ہے۔ اور دنیا کا اس لئے

کہ وہ ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے ضرورت اتنی ہوگی کہ قرآن کریم پر گہری نگاہ ہو اور اپنے زمانے کے تقاضوں اور تحریکوں کا علم ہو۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جو جزئی قوانین مرتب کئے جائیں گے، انہیں احکام شریعت کہا جائے گا۔ یہ جامد نہیں ہوں گے، مقتضیاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔ شریعت تو کہتے ہی اس راستے کو ہیں جو اس ندی کی طرف جائے جو رواں ہو۔''

شریعت کے معانی:۔ فقہ کے لئے جو معروف لفظ ''شرع'' استعمال کیا جاتا ہے اس کی بنیاد میں حرکت، نہ کہ جمود کا تصور موجود ہے۔ پرویز صاحب طلوع اسلام ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء (صفحہ نمبر ۲۸) میں کہتے ہیں۔ ''ہمارے ہاں شریعت کا لفظ تو ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے لیکن اس کے معانی پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ عربی زبان میں شریعت اُس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کے گھاٹ کی طرف لے جائے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ پانی بہنے والا (آبِ رواں) ہو۔ ایک مقام پر ٹھہرا ہوا (جوہڑ یا تالاب) نہ ہو۔ اگر پانی ساکن ہے تو عرب اس راستے کو ''شرع'' نہیں کہیں گے ''کرع'' کہیں گے۔ لہٰذا، جو طریقِ عمل جامد ہو کر رہ جائے اور زمانے کے رواں دواں تقاضوں کا ساتھ نہ دے، اسے شریعت کی راہ کہا ہی نہیں جائے گا۔'' طلوعِ اسلام کے اسی شمارے میں صفحہ نمبر ۲۵ پر وہ کہتے ہیں کہ:۔ ''حدیث سے بڑھ کر فقہ کی طرف آیئے۔ بعض قانون دان حضرات نے یہ کہا کہ قرآن تو ایک طرف، جو احکام احادیث میں بھی درج ہیں وہ بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے خود قوانین وضع کئے اور کہا کہ قرآن اور حدیث کے تمام احکام ان قوانین کے اندر آ گئے ہیں۔ اور یہ اسلام کے لئے کافی ہیں۔ انہیں ائمہ فقہ کہتے ہیں۔ جن میں سے چار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ۔ اور امام احمد بن حنبلؒ۔ ان فقہی قوانین کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں ایسے قوانین بھی ہیں جو قرآن کے بھی خلاف ہیں اور بعض احادیث کے بھی خلاف۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ ہے کہ حکم بہر حال فقہ کے قوانین کا نافذ ہوگا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسلم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ:۔ ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ بھی مؤول یا منسوخ ہے۔ (بحوالہ۔ تاریخ فقہ اسلامی۔ شائع کردہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ صفحہ نمبر ۴۲۱)۔''

دین الحق کے معنی:۔ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۵۸۔ اسی سلسلے میں پرویز صاحب ''حق'' کے بنیادی معنی بتا کر قانون سازی (فقہ) کی بابت ''ثبات و تغیر کے امتزاج'' کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔ ''قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ ''دین الحق'' تمام ادیانِ عالم پر غالب آ سکتا ہے تو اس میں ''الحق'' کی خصوصیت کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔۔۔ عربی زبان میں ''حق'' اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل بھی ہو، اور اس کے ساتھ

ہی، عندالضرورت متحرک بھی۔ عرب کس مقام پر ''حق'' کا لفظ بولتے تھے، اسے سمجھ لیا جائے تو ''دین الحق'' کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہے۔۔۔ آج کل ہمارے دروازوں میں قبضے (Hinges) لگے ہوتے ہیں لیکن پہلے زمانے میں دروازے کی چول، ساکٹ (Socket) میں فِٹ کی جاتی تھی۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دروازہ اپنے مقام پر محکم بھی رہتا تھا اور ضرورت کے مطابق کھلتا اور بند بھی ہوتا تھا۔ اس طریقِ عمل کو وہ لوگ ''حق'' سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ امام راغب، حق کے معنی مطابقت اور موافقت کرتے ہیں۔ دین وہی ''الحق'' ہوسکتا ہے جس کی کیفیت دروازے کی طرح ہو کہ حفاظت کے لئے وہ محکم طور پر بند بھی ہو سکے اور آنے جانے کے لئے کھل بھی سکے۔ اگر دروازہ مستقل طور پر بند رہے تو اسے دروازہ نہیں کہا جائے گا، اس کی حیثیت جامد دیوار کی سی ہو جائے گی۔ اور اگر وہ ہمیشہ کھُلا ہی رہے ، بند نہ ہو سکے تو اس میں اور کھُلے میدان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ دروازہ، جب تک، حالات کے مطابق، کھُلتا اور بند ہوتا رہتا ہے، دین کہلاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ جامد ہو جاتا ہے، مذہب بن جاتا ہے۔ لہٰذا، جو اسلام کو بحیثیت ''دین الحق'' زندہ کرنے کے متمنی ہیں، ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسے دروازے کی حیثیت سے ازسرِ نو قائم کریں۔''

قانون سازی کا اصول:۔ طلوعِ اسلام فروری ۱۹۸۰۔ صفحہ نمبر ۵:۔ ''اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کے ضمن میں سب سے زیادہ الجھاؤ، قانون سازی کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس گوشہ کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں اس بنیادی حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم بے شک مکمل ضابطہء حیات ہے لیکن اس نے (بجز چند احکام) دین کے اصول و اقدار دیئے ہیں۔ نہ ان اصولوں کی جزئیات خود مدون کی ہیں اور نہ ہی وہ طریقِ کار متعین کیا ہے جس سے ان اصول و اقدار کو نافذ کیا جائے گا۔ اسے اس نے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کرے۔ جس ضابطہء حیات کو تمام زمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لئے غیر متبدل ضابطہ قرار پانا تھا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ان جزئیات اور طریقِ کار کو بھی قرآن کے اندر دے دیا جاتا تو یہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہو جاتے اور ان پر عمل درآمد مشکل، بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں (بلکہ یوں کہیئے کہ انہیں ہونا ہی ایسا چاہیئے) لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طرق و اسالیب تو زمانے کے تقاضوں اور حالات کے تغیرات کے مطابق بدلتے رہنے چاہئیں۔ قرآن کریم کی یہ انتہائی حکمتِ بالغہ ہے کہ اس نے اسلامی مملکت کے لئے یہی طریقِ کار تجویز کیا ہے۔ یہی ختمِ نبوت کا بھی تقاضا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا ہے:۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (5:101)۔ ''اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے ان کی بابت خواہ مخواہ سوالات نہ

کیا کرو۔ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نبھانا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔'' اس کے بعد فرمایا: قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (5:102)۔''اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابل برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا اور جب انہیں نبھا نہ سکے تو (چونکہ وہ دین کی شکل اختیار کر چکی تھیں اس لئے) وہ سرے سے دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔'' تم ایسا نہ کرنا۔جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ خدا ان کے متعلق (معاذ اللہ) ہدایات دینا بھول گیا ہے۔قطعاً نہیں۔اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔اس آیہء جلیلہ کی تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرمادی کہ: اِنّ اللہَ فَرَضَ فرائضَ فلا تضیعوھا۔وحرمَ حُرُماتٍ فلا تنتھکواھا۔وحدحدوداً فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔''اللہ تعالیٰ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو (ان کی پابندی کرو)۔کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے۔ان کے متعلق کرید مت کرو۔(مشکواۃ۔کتاب تمسک بالقرآن والسنۃ۔اردو ترجمہ۔جلد اوّل۔صفحہ نمبر ۹۳)۔''

قانون سازی کا حق:۔طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۴ء۔ص۔۴۵:۔''فقہاء کے قوانین سازی کے حق کا سوال ہمارے ہاں شروع سے متنازعہ فیہ چلا آتا ہے۔اہل حدیث حضرات ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔لیکن جہاں تک اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے، اسے (بالواسطہ یا بلاواسطہ) متفق علیہ کہا جاتا ہے۔اور یہی وہ سوال ہے جس کے صحیح طور پر نہ سمجھنے سے امت میں اس قدر اختلافات، تفرقات اور الجھاؤ پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں۔اور کوئی حکومت کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں کر سکتی جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔اگر اس بنیادی نکتہ کو قرآنی روشنی میں سمجھ لیا جائے تو یہ ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔

(۱)۔سب سے پہلے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جب خدا نے کہا ہے کہ: وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔تو اس میں کسی کی بھی استثنیٰ نہیں کی گئی۔اس کے معنی ہیں کہ قانون سازی (حکومت) کا حق، اور تو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حاصل نہیں تھا۔اس کی وضاحت آیت نمبر (۳/۷۸) میں کر دی جہاں کہا کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے احکام کا محکوم بنائے۔(۲)۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا حکم تھا کہ آپ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائیں۔: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔۔۔(5:48)۔چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں سے بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت کراتے تھے اور خود بھی انہی احکام کا اتباع کرتے تھے۔:ان اتبع الا ما یوحیٰ الی۔۔۔(۶/۵۰)۔(۳)۔مقامِ اطمینان ہے کہ خود اہل

حدیث حضرات بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگ گئے ہیں کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں۔ طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ محدث پر تفصیلی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس میں سے دو ایک اقتباس یہاں مکرر درج کئے جاتے ہیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:۔ نظامِ خلافت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے وہی ہر چیز کا مالک اور قانون ساز ہے۔ ملتِ اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (ص۔ ۱۹۹)۔ ذرا آگے چل کر تحریر ہے:۔ اسلامی نقطہء نظر سے کسی فرد یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں ردوبدل کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (ص۔ ۲۰۰)۔''

اختیاراتِ قانون سازی:۔ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۸۳ء۔ ص۔ ۵۴:۔ ''جو چیز اسلامی نظامِ مملکت کو غیر اسلامی نظام سے ممتیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصول و اقدارِ خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں۔ اور ابدی اور غیر متبدل۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورہء الانعام میں ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:116)۔ ''تیرے رب کے اصول و قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی اتھارٹی تبدیلی نہیں کر سکتی۔'' (نیز۔ ۶/۳۴؛ ۷: ۱۸۳۳)۔ سورہء یونس میں ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ (10:64)۔ ''قوانین و حدودِ خداوندی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔'' ۔۔۔۔ اس کے برعکس، دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو، خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہی بنیادی تخصیص، اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے۔''

مجلسِ قوانین ساز کے حدود:۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۷ء۔ ص۔ ۱۱۔ ''قرآن کریم کی آیت نمبر ۶/۱۱۶ میں ہے کہ:۔ تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس لئے سربراہِ مملکت ہو، یا پارلیمان کا ادارہ، قرآنی احکام و اصولات میں نہ تو حک و اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے لئے قانون بنا سکتی ہے۔۔۔۔ اس اعتبار سے، اسلامی مملکت کی ''جمہوریت'' لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ ''کنٹرولڈ ڈیما کریسی'' ہو گی اور اس پر خدا کی کتاب کا کنٹرول ہو گا۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

فیصلہ کن ادارہ:۔ اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون قرآن مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ بھی جو قانون زیرِ ترتیب آئے اسے قرآن مجید کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالتِ عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ مملکت کے ہر باشندے کو حق ہونا چاہیئے کہ وہ اس مقصد کے لئے عدالتِ عالیہ کے دروازے پر دستک دے سکے۔'' (پرویز صاحب کی طرف سے ایک فیصلہ کن ادارہ کے قیام اور اس معاملہ میں عدالتِ عالیہ کے کردار کی تجویز پاکستان کے ہر آئین کی تدوین کے وقت دی جاتی رہی ہے)۔

قرآنی احکام کی تقسیم:۔ اپنی مشہورِ زمانہ کتاب سیرت (ﷺ) ''معراجِ انسانیت'' میں باب ''نظامِ مملکت'' میں قرآنی احکام کی تقسیم کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:۔ ''جہاں تک قرآن کریم کے احکام کا تعلق ہے، ان کی صورت یہ ہے کہ کہیں آپ کو ایسے احکام ملیں گے جن کی جزئیات تک بھی خدا نے خود ہی متعین کر دی ہیں، اور کہیں ایسے جنہیں صرف اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بے شک قرآن ان تمام اصولوں کو جو سفرِ زندگی میں انسانی راہنمائی کے لئے ضروری ہیں بیان کرتا ہے:۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (16:89)۔ ''اور ہم نے تجھ پر الکتاب نازل کی۔ (دین کی) تمام باتیں بیان کرنے کے لئے اور اس لئے کہ مسلمان کے لئے راہنمائی ہو، اور رحمت، اور خوشخبری۔'' اور واضح طور پر بیان کرتا ہے:۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (5:15) ''اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی ہے، اور ایسی کتاب آچکی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔'' اور ہر بات کو نکھار کر بیان کرتا ہے:۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:114) ''کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حَکم تلاش کروں۔ حالانکہ (اللہ وہ ہے) جس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔''

ایک اہم بنیادی بحث:۔ لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ بجز اُن جزئیات کے جن کی تعیین اس نے خود کر دی ہے، احکام کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے۔ تفصیل و تبیان کے یہ معنی نہیں کہ ہر حکم کی جزئیات و فروعات بھی متعین کر دی جائیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ بیان کیا جائے، کھول کر بیان کیا جائے۔ اصولی بیان بھی مجمل یا مفصل اور مبہم یا بین ہو سکتا ہے۔ قرآنی اسلوبِ بیان مجمل اور مبہم نہیں، مفصل اور مبین ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ قرآن میں بعض احکام کی جزئیات تک بھی بیان کر دی گئی ہیں (مثلاً نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق احکام) اور دیگر احکام کے سلسلہ میں

صرف اصول بیان کئے گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطہء حیات ہے:۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27) ۔ ''یہ (قرآن) تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطہ ہے۔'' تمام انسانوں کے لئے:۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (39:41) ۔ ''(اے رسول!) بلا شبہ ہم نے تجھ پر الکتاب (جو حق ہے) تمام نوعِ انسانی (کی ہدایت وراہنمائی) کے لئے اتاری ہے۔'' یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے اصولی تقاضے ایسے ہیں جن میں کبھی تغیر وتبدل نہیں ہوتا لیکن اس کی تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جن میں احوال وظروف کے بدلنے سے تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ چودہ سو سال پیشتر کے اہلِ عرب کی مدنیت کے مسائل اور ہمارے موجودہ زمانہ کے مسائل کی جزئیات میں بین فرق آچکا ہے۔ ہمارے زمانہ کے معاشی مسائل، بین الاقوامی تعلقات، سیاسی مطامح، عمرانی پیچیدگیاں، اور اسی نوع کے دیگر مسائل ایسے ہو چکے ہیں جو اُس زمانہ کے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ انسان ان مسائل ومعاملات کا حل، حق وصداقت اور عدل وانصاف کی رو سے چاہتا ہے تاکہ انسانی ذات کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا موقع ملے، اور انسانیت اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنی معراجِ کمال تک جا پہنچے۔ قرآن ان مسائل کے حل کے لئے اصولی قوانین عطا کرتا ہے جن کی جزئیات اپنے اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں متعین کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ وہ فٹ بال کے میدان میں چند حدود وخطوط متعین کر کے کھلاڑیوں کو میدان میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان حدود وقیود کے اندر رہتے ہوئے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق گیند کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائیں۔ زندگی کے ''کھیل کے میدان'' میں قرآن ان خطوط کو حدود اللہ کہتا ہے۔: وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (58:4) ۔ ''اور یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدیں ہیں۔'': فَلَا تَقْرَبُوْهَا (2:187)۔ ''پس (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) چاہیئے کہ ان (حدوں) کے قریب نہ ہو جاؤ (مبادا ان سے متجاوز ہو جاؤ)۔'' وہ ان مستقل حدود سے زندگی کا راستہ متعین کر دیتا ہے اور اس راستہ کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ وقتی اور ہنگامی حوادث ومسائل کے حل خود دریافت کریں۔ یوں سمجھئے کہ وہ اصولی قوانین وضع کر دیتا ہے تاکہ ان کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تبعی احکام (By Laws) خود متعین کرتا جائے۔ مثلاً قرآن کریم نے ربٰو (سود) کی حرمت کا حکم دیا ہے تو ربٰو کی تمام شکلوں کو گنا کر اس کے حکم کا حصر نہیں کر دیا، بلکہ اسے غیر متعین چھوڑ دیا گیا ہے چنانچہ آج ہمارے زمانہ میں ربٰو کی ایسی ایسی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں کہیں موجود نہ تھیں۔ یا مثلاً اس نے حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ یہ بتایا ہے کہ وہ ''زکوٰۃ کا انتظام کرے گی''۔ (زکوٰۃ کے معنی ہیں سامانِ نشوونما مہیا کرنا)۔ لیکن اس نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کیونکہ انسانی نشوونما کے تقاضے اور ان کو پورا کرنے کے اسباب وذرائع ہر دور میں مختلف ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے جن

احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دی ہیں، وہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ وہ جزئیات بھی ایسی ہیں جن میں مرورِ زمانہ سے کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جن احکام کو صرف اصولاً بیان کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کی جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ماتحت بدلی جا سکتی ہیں۔ اسلامی مملکت کا کام یہ ہے کہ وہ قرآنی احکام اور اس کی متعین فرمودہ جزئیات کو نافذ کرے، اور اصولی احکام کی جزئیات اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں مرتب کرے۔ ان احکام کی تنفیذ اور تبعی احکام کی ترتیب و تدوین کا کام ملت کے اربابِ فکر و نظر کے مشورہ سے طے پائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ:۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ (3:159) ''اور معاملاتِ حکومت میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا، تو چاہیئے کہ خدا پر بھروسہ کرو (اور جو کچھ ٹھان لیا ہے اُس پر کاربند ہو جاؤ) یقیناً اللہ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ کرنے والے ہیں۔'' دوسری جگہ ہے:۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۖ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۖ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ (42:38) ۔ ''اور (مومن وہی ہیں) جنہوں نے اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیا۔ اور صلوٰۃ کا نظام قائم کیا۔ اور جن کے امورِ حکومت آپس کے صلاح مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ اور ہم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اسے نوعِ انسان کی منفعت کے لئے خرچ کرتے ہیں۔''

تعین جزئیات (قانون سازی) کا طریق:۔ قرآن کریم خدا کی عطا کردہ کتاب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ضابطہء قوانین ہے کیونکہ کتاب کے معنی یہی ہیں۔ پرویز صاحب طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۷ء (صفحہ نمبر ۲۵) میں کہتے ہیں کہ:۔ ''خدا نے قرآن کو کتاب کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک۔ت۔ب) ہے جس کے معنی، حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب کے معنی ضابطہء قوانین کے ہوں گے۔'' اب اسی ضابطہء قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، انسان اپنے اپنے زمانے کے مطابق ضمنی قوانین (By -laws) بنائے گا۔ اس کا طریقہ کیا ہوگا، اس بارے میں پرویز صاحب ''مطالب الفرقان'' میں رقمطراز ہیں۔ ''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ رسولوں کے سلسلہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ اس قسم کی نئی جزئیات نئے رسول کی وساطت سے ملتی تھیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا اور حضور ﷺ کے بعد کسی اور رسول نے آنا ہی نہیں تو جزئیات کے تعین اور ان میں عندالضرورت تغیر و تبدل کے لئے طریق کیا بتایا گیا؟۔ آیت نمبر ۱۰۲۔ ۱۰۱/۵۔ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نزول قرآن کے دوران بھی ان جزئیات کا تعین وحی کی رو سے کیا جانا مقصود نہیں تھا۔ لہٰذا ان جزئیات کے تعین و تبدل کے لئے جو طریق حضور ﷺ کے بعد تجویز کیا گیا تھا اسے خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں اختیار کر لیا گیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ'' وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ

''(3:158)۔'' یہ امور اپنے رفقاء کے مشورہ سے طے کیا کرو۔'' یعنی ان جزئیات کا تعین وتغیر وتبدل، باہمی مشاورت سے ہوگا وحی کی رو سے نہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد فرمودہ اس طریق (شورائیت) کے مطابق ان جزئیات کا تعین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد اس کے لئے کیا طریق تجویز کیا گیا؟۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ جو نظام شورائیت (اسلامی نظام مملکت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں قائم ہوا تھا، اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا، اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم رکھا جانا مطلوب تھا، سورہ آل عمران میں ہے:۔

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بجز ایں نیست، کہ خدا کے ایک رسول ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول آئے (اور اپنا اپنا مشن پورا کرکے) دنیا سے چلے گئے۔ اگر کل کو یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ بس دین کا نظام ختم ہو گیا، اور اس کے بعد تم پھر اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے! یادرکھو! جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور جو لوگ اس نظام کو قائم رکھیں گے، اُن کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی۔'' (۳/۱۴۴)۔

ثبات و تغیر کا امتزاج:۔ یعنی جو نظام مملکت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ میں قائم ہوا تھا اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اور تعین وتغیر جزئیات کے لئے جو حکم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیا گیا تھا اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد بھی عمل ہونا تھا۔ چنانچہ (جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا گیا تھا کہ ان امور کا تعین باہمی مشاورت سے کیا کرو، اسی طرح) جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا:۔ '' وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ '' (42:38)۔ ''اُن کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔''

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ''الدین'' کے اصول وقوانین، اقدار واحکام، جو قرآن کریم کے اندر موجود ومحفوظ ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اور جو تفاصیل اس میں نہیں دی گئیں ان کا تعین، اور حالات کی تبدیلی کے مطابق ان میں تبدیلی، اسلامی نظام مملکت کے ذریعے ہوگی۔ ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے اس حسین امتزاج سے کاروان انسانیت، شاداں وفرحاں اپنی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ اگر اس میں کوئی اصول ناقابل تغیر نہ ہو تو اس کی مثال اس کشتی کی سی ہو جائے گی جسے لنگر کے بغیر حوادث زمانہ کی طغیانیوں میں چھوڑ دیا جائے اور اس میں کوئی شے قابل تغیر نہ ہو تو وہ جامد اور متحجر بن کر رہ جائے۔ اس کی نمود اور ارتقاء ختم ہو جائے۔ (ہر دور میں قانون سازی کے لئے یہی طریق کار اختیار کیا جائے گا)۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور حضور ﷺ کے بعد جب تک قرآنی نظام قائم رہا (جسے خلافت علیٰ منہاج رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ثبات وتغیر کا یہ امتزاج بھی باقی رہا۔ اس نظام کا یہی وہ زوردروں تھا جس کی وجہ سے اس امت نے چند برسوں میں وہ وسعتیں اور بلندیاں حاصل کرلیں کہ جن کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ لیکن وائے بدقسمتی! کہ اس کے بعد یہ نظام قائم نہ رہا، اور جب یہ نظام ہی باقی نہ رہا تو اصولی احکام کی جزئیات کے تعین اور تغیر کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اس وقت دین ''مذہب'' میں تبدیل ہوگیا۔''

طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۱۱:۔ ''یہ تھا قیامت تک رہنے والے دین کا وہ نقشہ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا۔ لیکن ہمارے قدامت پرست حضرات کا عقیدہ ہے کہ خدا کو یہ جزئیات مرتب کرکے دینا چاہئیں تھیں، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ جزئیات عہدِ رسالتمآب ﷺ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں متعین ہوئیں اور ان کا قیامت تک غیر متبدل رکھا جانا مقصود ومطلوب تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے روایات کے مجموعے اور کتبِ تاریخ مرتب ہوئیں، اور پھر ان میں کرید شروع ہوئی۔ اس کرید سے کسی کو کچھ ملا، کسی کو کچھ (اس لئے کہ ان کتابوں میں تضادات تھے) جس کو جو کچھ ملا، اس نے اسے غیر متبدل قرار دے لیا۔ اس طرح مختلف فرقے وجود میں آگئے، جن میں سے ہر ایک کا اسلام، الگ الگ ہے۔

فقہ کی کتابیں مرتب ہوجانے کے بعد، مزید کرید ختم ہوگئی۔ کیونکہ ان میں مندرج جزئیات کو غیر متبدل سمجھ لیا گیا۔ یہ کرید امورِ دینیہ تک محدود تھی، امورِ مملکت ان کے دائرے سے باہر تھے کیونکہ ملوکیت، آزاد رہنا، یا ان میں سے اپنی مصلحت کے مطابق کچھ اختیار کرنا، چاہتی تھی۔''

قوانین کی جزئیات (قانون سازی):۔ طلوعِ اسلام مئی جون ۱۹۸۲ء۔ صفحہ نمبر ۲۷:۔ ''یہ جو واقعہ ہے کہ نہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ مرتب ہونے دیا، نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا، تو ایسا سہواً نہیں کیا گیا۔ دانستہ کیا گیا۔ یہ خدا کے پروگرام کے مطابق تھا۔ قرآن کریم مکمل ضابطہء حیات ہے لیکن اس کی صورت ایسی ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) اقدار واصول دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کیں۔ یہ اس لئے کہ دین کے اصول واقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنے تھے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، اور ان قوانین کی جزئیات کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اگر وہ جزئیات بھی قرآن کریم کے اندر دے دی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پا جاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال وکوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عمل درآمد مشکل (بلکہ ناممکن) ہوجاتا، تو اُمت خود نفسِ اسلام ہی سے بدظن ہوجاتی اور خیال کرلیتی کہ اسلام ماضی کے کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا، لیکن اب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس سے وہ خود دین ہی کو خیرباد کہہ دیتی۔ (جیسا کہ

پاکستان میں ہوا ہے۔ حکومت نے ہزار برس پہلے کے تعزیری احکام کو اسلامی احکام کہہ کر نافذ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد، خود صدرِ مملکت۔ ضیاء الحق۔ کو اعتراف و اعلان کرنا پڑا کہ ان احکام پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے دل میں نفسِ اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات ابھرنے شروع ہو گئے)۔ قرآن کریم نے سورہء المائدہ کی درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝ (5:101-102) ۔''اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں، انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے، اگر (بفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دے دیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ اور جب تغیر حالات کی بناء پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائے گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم (بنی اسرائیل) نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہٰذا، جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تو انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔''اس کی وضاحت ایک حدیث میں ملتی ہے:۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ تم انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ باتیں حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک نہ پھٹکو۔ اس نے کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ امور کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے، تم ان کے متعلق کرید مت کرو۔ کیونکہ خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا، دانستہ کیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ باب اعتصام بکتاب وسنت)۔۔ نبی اکرم ﷺ نے نظامِ حکومت قائم فرمایا تو قرآن کریم کے اصول وقوانین کی جزئیات بھی خود متعین کیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بھی۔ یہ سب کچھ صحابہؓ کے مشورہ کے ساتھ (کیونکہ ایسا کرنے کا حضور ﷺ کو حکم دیا گیا تھا۔ ۱۵۸/۳) اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں رہنا تھا۔ زمانے

کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان میں ردوبدل ہونا ضروری تھا۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں عہدِ رسالتمآب ﷺ کی کئی ایک جزئیات میں تبدیلی اور اضافہ کیا گیا۔ (تفصیل میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی)۔ حضور ﷺ نے اپنے ان ارشادات کو اس لئے مرتب کرنے سے روک دیا کہ امت انہیں غیر متبدل خیال کر لے گی اور اس سے اسی مشکل میں پھنس جائے گی جس کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے خود بھی انہیں مرتب نہ فرمایا اور صحابہؓ کو بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سنتِ نبوی ﷺ کا

اتباع کیا اور احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ یہ وجہ تھی جو جامعینِ حدیث کو اپنے سے پہلے کا مرتب شدہ کوئی مجموعہء احادیث نہ مل سکا۔ اگر قرآنی نظامِ حکومت، خلافتِ راشدہ کے بعد مسلسل آگے چلتا تو ضابطہء قوانین بنانے کے لئے ان مجموعوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ یہ تو اُس نظام کے معدوم ہو جانے کا نتیجہ تھا جو ''اطیعوالرسول'' کا مختلف مفہوم ذہنوں میں آیا جس کی وجہ سے اس مقصد کے لئے احادیث جمع کرنے کی ضرورت پڑی۔'' (اطیعواللہ واطیعوالرسول کا قرآنی مفہوم ''نظریہء حدیث'' میں ملاحظہ فرمائیں)۔

مشاورت برائے قانون سازی:۔ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۱ء۔ص۔۱۱۔ ''سوال یہ ہے کہ قرآنی اصول واحکام کی یہ جزئیات اور اسلامی حکومت کے قیام کے طرق واسالیب جنہیں قرآن مجید میں دانستہ نہیں دیا گیا، انہیں کس طرح مرتب کیا جائے گا کیونکہ ان کے بغیر اسلامی مملکت کا قیام ہی ممکن نہیں۔ قرآن مجید نے بتا دیا ہے کہ ان کا تعین اسلامی مملکت، باہمی مشورہ سے کرے گی۔ اس باب میں اس نے سب سے پہلے خود حضور نبی اکرم ﷺ سے فرمایا: **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:158) ۔ ''معاملاتِ حکومت اُن کے مشورے سے طے کیا کرو۔'' اس آیت میں ''ھم'' (جمع غائب) کی ضمیر واضح کرتی ہے کہ اس مشاورت میں پوری کی پوری اُمت شریک ہوگی۔ چونکہ اسلامی مملکت کو حضور ﷺ کے بعد بھی قائم رہنا تھا اس لئے خود اُمت کے متعلق ارشاد ہوا کہ: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38) ۔ ''ان کے امورِ مملکت، ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔'' یہاں بھی ''امرھم'' کی ضمیر نے واضح کر دیا کہ یہ حکومت پوری کی پوری اُمت کی ہوگی۔ اور ''بَيْنَهُمْ'' کی ضمیر نے بتا دیا کہ اس مشاورت میں پوری اُمت شریک ہوگی۔ اس مشاورت کی مشینری کیا ہوگی اور اسے کس طرح متعین کیا جائے گا، قرآن کریم نے ان جزئیات کو بھی خود متعین نہیں کیا۔ اسے بھی اسلامی مملکت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں خود متعین کرے۔ ان تصریحات سے حسب ذیل نکات واضح ہو جاتے ہیں:۔ (۱)۔ اسلامی مجلسِ مشاورت کے اختیارات غیر محدود نہیں ہوں گے۔ یہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت کے متعلق فیصلے کرے گی۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جس سے اسلامی مشاورت، مغربی جمہوریت سے متمیز اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت میں مجلسِ قوانین ساز کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں۔ اسی کو سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے۔ (۲)۔ اسلامی مجلسِ مشاورت نہ قرآنی اصول واقدار میں اضافہ کر سکے گی اور نہ ہی ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل۔ اضافہ اس لئے نہیں کیا جا سکے گا کہ یہ قرآن کے مکمل ہونے کے دعویٰ کے خلاف ہوگا۔ اور تغیر وتبدل اس لئے نہیں کیا جا سکے گا کہ یہ قرآن کے دوسرے دعویٰ کے خلاف ہوگا جس میں اس نے کہا ہے کہ کلمات اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ اس مجلس کا فریضہ قرآنی اصول واقدار کا نفاذ ہوگا۔ (۳)۔ اسلامی مجلسِ مشاورت کے فیصلے غیر متبدل نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ غیر متبدل

ہونے کی خصوصیت صرف کتاب اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی غیر متبدل تسلیم کیا جائے گا تو یہ اس قانون کو قرآن کی مثل یا اس کا ہمسر قرار دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآنی اصول وقوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور ان کی حدود کے اندر اسلامی حکومتوں کے فیصلے، قابلِ تغیر وتبدل۔ اگر کسی زمانہ کی اسلامی حکومت کے فیصلوں کو ابدی (یعنی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل) قرار دے دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے یہ قوانین، قرآن کے ہم پایہ قرار پا جائیں گے، بلکہ قرآن مجید نے اُمت کو جو مشاورت کا حکم دیا ہے، اس حکومت کے بعد امت کے لئے مشاورت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اور یہ قرآنی نظام کے صریحاً خلاف ہے۔ قرآن کا مشاورت کا حکم ہمیشہ کارفرما رہنا چاہیئے۔ اسی کو بالفاظِ دیگر یوں کہا جائے گا کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اجتہاد حکومت کا فریضہ ہوگا۔ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس اجتہاد کا نتیجہ قانون کی حیثیت اختیار کر لے گا اور قانون سازی اور قانون کے نفاذ کا اختیار صرف مملکت کو ہوگا نہ کہ کسی فرد یا افراد کے گروہ کو۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔ ''بغدادی نے امام اعظمؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پاتے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ بغدادی۔ جلد نمبر ۱۳)۔ امام ابن قیمؒ نے اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔ اللہ کی شریعت کا مقصود بندوں میں عدل وانصاف کا قیام ہے۔ جس طریق سے عدل و انصاف قائم ہو جائے وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا (الطریق الحکمیہ)۔'' پھر آگے صفحہ نمبر ۸ پر لکھا ہے کہ:۔ ''تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ نہ کسی زمانے کی اسلامی حکومت کے وضع کردہ احکام ابدی اور غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا طریق کار غیر متغیر۔ ہمارے ہاں جس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں وہ اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہیں۔ اگر قرآن مجید کے اس اصل الاصول کو بنیاد قرار دے لیا جائے تو نہ اسلامی مملکت اور حکومت کے قیام کے سلسلہ میں کوئی الجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ ہی قوانین سازی کے سلسلہ میں کوئی پیچیدگی یا دشواری۔ ہمارے ہاں ساری پیچیدگیاں اور دشواریاں اس لئے پیدا ہو رہی ہیں کہ ہم خارج از قرآن احکام وضوابط کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ کر، انہیں بعینہٖ اپنے ہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔''

مشاورت کا ابدی حکم:۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۳۲۔ ''مشاورت کا حکم وقتی یا ہنگامی نہیں۔ یہ ابدی حکم ہے جس کا اطلاق ہر زمانے کی اسلامی مملکت پر یکساں ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی سابقہ زمانے کی اسلامی مملکت کے، مشاورت کی رو سے طے شدہ جزئی قوانین اُس زمانے کے لئے شرعی احکام کہلا سکیں گے۔ آنے والے زمانے کی اسلامی مملکت پر ان کی پابندی لازم نہیں ہوگی۔ وہ خود، اپنے طریقِ مشاورت سے ان احکام کو وضع اور نافذ کرے گی۔ اس اعتبار

سے دیکھئے تو کسی سابقہ زمانے کے فقہی احکام، آنے والے زمانے کے لئے، غیر متبدل احکام شریعت قرار نہیں پا سکتے۔ یوں بھی، قرآن کریم نے صرف کلمات اللہ (خدا کے احکام) کو غیر متبدل کہا ہے۔ اگر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل سمجھ لیا جائے تو یہ انہیں خدائی صفت سے متصف کر دینے کے مرادف ہوگا۔ جہاں تک متداول فقہی احکام کا تعلق ہے، یہ تو کسی اسلامی مملکت میں مشاورت کی رو سے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ یہ دورِ ملوکیت میں، بعض قانون دان حضرات نے اپنی صوابدید کے مطابق مرتب کئے تھے۔ یہ اس اعتبار سے بھی ہمارے دور میں اسلامی نہیں کہلا سکتے۔'' جو مملکت قرآن کے مطابق، امت کی مشاورت سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین مرتب کرے گی، اس کے ''جزئی قواعد ہمارے لئے احکامِ شریعت قرار پائیں گے۔ چونکہ یہ ہمارے اپنے وضع کردہ ہوں گے اور جن اسباب و وجوہ کی بناء پر انہیں وضع کیا جائے گا، وہ بھی ہمارے سامنے ہوں گے، اس لئے ان سے خوف وحزن پیدا نہیں ہوگا۔ ہزار سال پہلے کے قانون دان حضرات کے وضع کردہ فقہی احکام کو احکامِ شریعت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔''

حکمتِ حکمِ مشاورت:۔ قرآن کریم کے حکمِ مشاورت میں یہ عظیم حکمت موجود ہے کہ مشاورت ہی ہر زمانے میں ہر نئے مسئلے کا حل دریافت کرنے کے قابل بناتی ہے۔ علماء وحکماء نے اسی لئے قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے راہنما مانا ہے۔ قرآن کریم کے کافی ہونے اور اسلام کے ہر دور کا دین ہونے کا مطلب یہی ہے کہ امت ہر دور میں باہمی مشاورت سے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے مسائل کا حل تلاش کرتی چلی جائے گی۔ یعنی حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کرتی چلی جائے گی۔ اسی کو شریعت کہا جائے گا۔

ختمِ نبوت اور مشاورت:۔ ختمِ نبوت کا بھی یہی مقصد ومفہوم ہے کہ حضور ﷺ کے بعد (چونکہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا، لہٰذا) آئندہ، قیامت تک، امت کے تمام امور باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ اگر احادیث اور سنت کو مستقلاً اور ابداً قانونی و آئینی حیثیت دینا مقصود ہوتا تو قرآن کریم میں حضور ﷺ کو رفقاء سے (۱۵۸/۳) اور پھر امت کو باہمی مشاورت سے معاملات طے کرنے کا حکم (۳۸/۴۲) نہ دیا جاتا۔ اس معاملہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، علامہ اقبالؒ اور پھر مولانا مودودیؒ کے نظریاتِ حدیث وسنت کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس تالیف میں بھی اختصار سے ان کے یہ نظریات پیش کر دیئے گئے ہیں (مئولف)۔

(جاری ہے)

عمر احمد عثمانی

قرآنی معاشرہ

(باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیمات)

قوموں کی زندگی میں اس کے کردار کیریکٹر، اور خصائص وامتیازات کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کسی قوم کا اپنا کردار اور کیریکٹر ہی ہوتا ہے جس سے وہ دوسری اقوام میں ممتاز نظر آتی ہے۔ جب کسی قوم کا کردار ہی فنا ہو جائے تو وہ قوم تادیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ غیر محسوس طریقہ پر دوسری اقوام میں جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹیے اور برّعظیم پاک وہند میں بسنے والے مسلمانوں کی ایک صدی پہلے کی حالت کا جائزہ لیجئے۔ اور پھر اس حالت کا آج کی حالت سے موازنہ کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سلطنت وحکومت سے محروم ہو کر انگریز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جہالت اور تاریکی ان پر غالب تھی 1857ء کی تحریک آزادی کے بعد وہ ہر جگہ انگریزی مظالم کا شکار تھے نہ ان کی جانیں محفوظ تھیں نہ عزت وآبرو۔ اس تحریک کی ناکامی سے مایوسیوں نے ان پر غلبہ پالیا تھا۔ لیکن بریں ہمہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاشرہ میں (اوپر کے مخصوص طبقہ کو چھوڑ کر) انفرادی طور پر عوام کی اخلاقی حالت ایک خصوصیت ضرور رکھتی تھی۔ اس خصوصیت کا اثر تھا کہ ہم اپنے بچپن کے زمانہ تک ہندوؤں کی زبان سے یہ سنا کرتے تھے کہ دیکھئے صاحب! یہ مسلمان ہو کر بھی جھوٹ بولتا ہے؟ یعنی اس زمانہ کے افراد نے اپنے کردار سے اس حقیقت کو بطور مسلمہ کے پیش کر دیا تھا کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ اسی طرح، انفرادی، اخلاق کے دوسرے شعبوں میں بھی مسلمانوں نے اپنی خصوصیات کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا تھا۔

آج ہم آئینی طور پر انگریز کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور سلطنت خداداد پاکستان کے آزاد شہری ہیں۔ ایک صدی پہلے کے مقابلہ میں علم وفن میں بھی ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ تنگ نظری اور جہالت کے جال سے اگرچہ ہم پوری طرح پر نہیں نکل سکتے لیکن بلاشبہ اب سے سو سال پہلے کے مقابلہ میں ہماری حالت بدرجہا بہتر ہے مایوسی کی جگہ اُمیدیں ہیں۔ ناکامیابی کی جگہ کامیابیاں ہیں۔ زرعی طور پر ہماری حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صنعتی میدان میں بھی ہم نے (قابل ذکر نہ سہی، لیکن بہرحال) نمایاں ترقی کی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک چیز کی کمی ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہے اور وہ کردار اور کیریکٹر کا فقدان ہے۔ برعظیم ہندوپاک کے مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ مسلمانوں کی حالت

ناگفتہ بہ ہے۔ خودغرضی، چالاکی، فریب، جھوٹ، تن پروری ہمارے وہ خصائص ہیں جو ہم سب میں مابہ الاشتراک ہیں۔ اس میں نہ مسٹر کی قید ہے نہ مُلّا کی، نہ کالج کی نہ مدرسہ کی، نہ کرسی قیادت کی، نہ سجادۂ خانقاہ کی۔ بدقسمتی سے اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

بیسویں اور اکیسویں صدی علمی اور فنی لحاظ سے بڑی اہم صدیاں ہیں۔ جدید تحقیقات واختراعات اور نت نئے انکشافات وتجربات نے بہت سی ان پُرانی اقدار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے جن پر قوموں کے کردار اور کیرکٹر کی بنیاد ہوتی ہے۔ یورپ اس باب میں خوش نصیب تھا کہ اسے بروقت ایسے راہنما مل گئے جو پرانی اقدار کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوموں کو نئی اقدار دیتے چلے گئے اس لیے یورپ کی اقوام کو پرانی بنیادوں کی جگہ وہ نئی بنیادیں ملتی چلی گئیں جن پر ان کے کردار اور کیرکٹر کی تعمیر ہوتی رہی۔ مگر مشرق اس باب میں نہایت مفلس ثابت ہوا۔ جدید وقدیم کے اس تصادم نے جہاں پُرانی اقدار کی بنیادیں ہلا دیں وہاں ان کو کوئی نئی بنیادیں مہیا نہ کی جاسکیں۔ ان میں کچھ ہمارا یا ہمارے قومی راہنماؤں کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ علمی اور فنی اعتبار سے ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکے تھے جہاں پہنچ کر جرأت وبیباکی کے ساتھ انسان خود آگے قدم بڑھاتا اور اپنے لیے اپنی نئی دنیا خود تعمیر کرتا ہے۔ ان کے سامنے اپنے ہاں کی قدیم اقدار تھیں جو گلستانِ سعدی یا اخلاق جلالی وغیرہ پر مبنی تھیں یا پھر یورپ کی وہ جدید اقدار تھیں جو سائنٹفک تحقیقات یا مادیت پرستی نے اس کو مہیا کی تھیں۔ علمی تحقیقات اور فنی تجربات کے اس ریلے کے سامنے پُرانی اقدار تادیر قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ نہیں رہ سکیں اور جدید اقدار کو مشرق اس لیے نہیں اپنا سکا کہ وہ اس کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھیں۔ مشرق کی طبیعت اور مزاج میں مذہب کا خمیر ہزارہا سال سے یوں رچا بسا چلا آرہا ہے کہ اسے اس سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

ان پُرانی اقدار پر جو ہمیں سعدی، رومی اور تفتازانی سے وراثت میں ملی تھیں ہمارا ایمان اس لیے باقی نہ رہ سکا کہ علم وتجربہ نے ان کی غلطیاں ہم پر واضح کردی تھیں اور جدید اقدار پر ہم اس لیے ایمان نہ لاسکے کہ ان میں ہمیں کھلا ہوا شرک اور بے دینی نظر آرہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کردار اور کیریکٹر کے لحاظ سے بالکل ہی دیوالیہ ہوکر رہ گئے۔

رہنمایانِ قوم کا فرض تھا کہ وہ وقت کی اس ضرورت کو ہر وقت محسوس کرتے اور جو پُرانی بنیادیں ختم ہوتی جارہی تھیں ان کی جگہ قوم کو نئی بنیادیں مہیا کرتے جاتے۔ خدا کی زندہ کتاب (قرآن کریم) ان کے پاس موجود تھی جو ہر سفر حیات میں ہمارے لیے دلیل راہ بن سکتی ہے۔ مگر شاید ابھی اس کا وقت ہی نہیں آیا تھا کہ ہم اپنی ہر راہ نمائی کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا سیکھیں۔

طلوع اسلام کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس نے یہ آواز اٹھائی کہ ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لیے خدا کی اس زندہ

کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہئے جس پر خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے عمل کر کے دنیا میں وہ بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ آج تک کوئی قوم اس مقام تک نہیں پہنچ سکی۔ خدا نے اس کی آواز میں برکت عطا فرمائی اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب آہستہ آہستہ وہ طبقہ بھی جو لفظی طور پر اس کی مخالفت کو ''جہادِ عظیم'' سمجھ رہا ہے، معنوی طور پر اس کا ہم نوا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس نے بھی قرآن کا نام لینا شروع کر دیا ہے۔ اس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ کھل کر قرآن کے ساتھ آ جائیں اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا پیکر بن جائیں۔

◆◆◆◆

حالیہ اشاعت سے طلوعِ اسلام میں ''قرآنی معاشرہ'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین مکرر شروع کیا جا رہا ہے جس میں بتایا جائے گا کہ قرآن کریم مسلمانوں کا کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور مسلم قوم کا دوسری اقوام کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہونا چاہئے۔ قرآن کریم کی یہ وہ معاشرتی ہدایات ہیں جو ہمارے قومی کردار اور انفرادی کیریکٹر کی صحیح تعمیر کر سکتی ہیں۔ یہ وہ اقدار ہیں جو یقینی اور اٹل ہیں۔ ان کی بنیادوں پر جو کیریکٹر اور کردار تعمیر ہوگا وہ یقیناً دنیا کے بڑے سے بڑے انقلاب کا مقابلہ کر سکے گا اور بڑے بڑے تھپیڑے بھی اس کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکیں گے۔ یہ سلسلۂ مضامین اس سے پہلے اپریل 1956ء سے ماہنامہ طلوعِ اسلام میں چھپتا رہا ہے۔

معاشرہ میں سب سے پہلا تعلق وہ تعلق ہے جو اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے ہم معاشرہ کی اس شق کو لیتے ہیں۔

والدین:

اولاد کا اپنے والدین کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے وہی اس کی تولید کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اولاد کا بچپن ایسا ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر والدین کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور چلنا سکھاتے ہیں۔ پھر اس کی تعلیم و تربیت کا وقت آ جاتا ہے تو وہ حسبِ مقدور اس فریضہ کو بھی ادا کرتے ہیں اور بچہ کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی میں اپنا مقام حاصل کر لے اور صحیح معنوں میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر سفرِ زندگی شروع کر سکے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک:

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اولاد جوں جوں بڑی ہوتی جاتی ہے۔ والدین کی عمر انحطاط پذیر ہوتی جاتی اور

ان کے قوائے عمل مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں پژمردہ اور ان کی قوتوں میں کوتاہی آتی جاتی ہے۔ جیسا کہ کل اولاد کو اس کی ضرورت تھی کہ والدین اسے سہارا دیں ایسے ہی آج والدین کو اس کی ضرورت ہے کہ ان کی اولاد انہیں سہارا دے۔ اس مقام پر غور کیجیے کہ حیوان اور انسان میں فرق کیا ہے؟ حیوانات بھی اپنے بچوں کی پرورش اسی جذب وانہماک سے کرتے ہیں جس سے انسان اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ گویا اولاد کی پرورش کا جذبہ حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے اور جبلت کا تقاضا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس پر زور دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ ماں باپ کو چاہئے کہ اولاد کی پرورش کیا کریں۔ لیکن حیوانات میں اولاد کا کوئی تعلق ماں باپ کے ساتھ باقی نہیں رہتا اس لیے وہ بڑھاپے کے زمانے میں ماں باپ کے کسی کام نہیں آتی۔ گویا ماں باپ کے کام آنا حیوانی جبلت کا تقاضا نہیں۔ اس لیے قرآن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اولاد سے تاکید کرے کہ وہ ماں باپ کی ضعیفی کے زمانہ میں ان سے حسن سلوک سے پیش آئیں اس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہ سکتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔۔۔(4/36)

خدا ہی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار کرو اور اس کی اطاعت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔

وحی خداوندی کی یہ ہدایت ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اقوام گذشتہ کو بھی اسی قسم کی ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔۔۔(2/83)

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ تم خدا کے سوا کسی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو گے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وحی الٰہی کا یہ حتمی فیصلہ ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی کہ انسان کو ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک ہی کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔۔۔(17/23)

تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی ہستی کی اطاعت اور فرماں پذیری اختیار نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط۔۔۔۔(29/8)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کس قدر اہمیت دی ہے کہ توحید الوہیت کے بعد دوسرا حکم یہی دیا گیا ہے کہ والدین کے ساتھ ''احسان'' کیا جائے۔ احسان کے معنی یہی نہیں ہیں کہ روپیہ پیسہ سے ان کی مدد کر دی جائے بلکہ احسان کے معنی یہ ہیں کہ جتنی جتنی کمی ان میں آتی جا رہی ہے اس کو تم اپنی محنت سے پورا کرتے جاؤ تا کہ ان کی زندگی غیر متوازن نہ رہ جائے۔ اس کا حسن ختم نہ ہو جائے۔ ان کی زندگی آخر تک توازن بدوش رہے کیونکہ احسان نام ہے حسن پیدا کرنے کا اور تناسب کے بغیر حسن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

والدین کی اطاعت:

یہ موضوع ذرا نازک سا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ قرآن کی رو سے اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ سمجھنے کے لیے ایک کو اطاعتِ مطلق اور دوسری کو اطاعت مقید کہہ لیجیے۔ اطاعت مطلق تو یہ ہے کہ کسی کی فرماں برداری غیر مشروط کی جائے اس اطاعت اور فرماں برداری کو قرآن عبادت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اطاعت قوانین خداوندی کے سوا کسی اور کی نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں سے اس قسم کی اپنی اطاعت کرا سکیں۔ محولہ بالا آیات میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی اطاعت کو خدا کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور حصر کے ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ اس قسم کی اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی نہ کی جائے۔ اگر اس قسم کی اطاعت میں کسی دوسری ہستی کو شریک کیا جائے تو وہ قرآن کی میزان میں شرک ہے۔ اطاعت کی دوسری قسم یعنی مقید اطاعت یہ ہے کہ خدا نے اپنی وحی کے ذریعہ سے انسانوں کے لیے جو حدود (Boundry Lines) مقرر کر دی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے کسی کی اطاعت کی جائے۔ اس قسم کی اطاعت کا حکم رسول اور اولی الامر (مرکز ملّت اور ارکان حکومت) کے لیے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ۔۔۔(4/59)

اے پیغمبر اسلام کہ دو کہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور ان ارباب حکومت کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں۔

جہاں تک اس دوسری قسم کی اطاعت یعنی اطاعت مقید کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ والدین کے لیے اس قسم کی اطاعت کا کہیں اس طرح حکم نہیں دیا جیسا کہ رسول اور ارباب حکومت کی اطاعت کا صراحۃً حکم دیا

گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس باب میں ایک ایسی روش کو تجویز کیا ہے جس کی مثال دنیا کے مذہب و اخلاق میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیا کے کسی ضابطۂ اخلاق کو دیکھئے۔ ہر جگہ یہی لکھا ملے گا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن قرآن میں ایسا کہیں لکھا نہیں ملے گا۔ بات یہ ہے بھی بالکل واضح۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے (اور تجربہ اس کی تائید) کہ انسان جوں جوں انحطاط کی عمر میں پہنچتا ہے اس کی عقل میں کمی آتی جاتی ہے اور (قرآن کے الفاظ میں) جو کچھ اس نے پہلے سیکھا ہوتا ہے وہ بھی بھولتا جاتا ہے۔ اب آپ خیال کیجئے کہ قرآن کبھی اس کا حکم دے سکتا ہے کہ ایک انسان جس کے قوائے ذہنی عروج پذیر ہیں جو نئے نئے تجربات حاصل کرتا ہے جو دن بدن آگے بڑھتا ہے اس انسان کے فیصلوں کے تابع چلے جس کی عقل اوندھی ہو چکی ہے جو اس سے پچاس برس پیچھے کے زمانہ کا ہے جس کا علم پرانا ہو چکا ہے۔ قرآن کبھی ایسا حکم نہیں دے سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ایک بچہ، بچپن کے زمانہ سے گزرتا اور سن شعور تک نہیں پہنچتا، وہ اپنے ماں باپ کے فیصلوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس عمر میں اسے یقیناً ان کے کہنے کے مطابق چلنا چاہئے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں جو احکام خداوندی کے خلاف جاتی ہو تو اسے اس سے انکار کر دینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کے مسلک کو بطور اسوہ پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنے باپ سے برملا کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا (وہ مہاراجہ رام چندر کی روش کو بطور نمونہ پیش نہیں کرتا جنہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ باپ محض اپنی بیوی کی پاسداری سے ایک غلط حکم دے رہا ہے اس حکم کی تعمیل میں بن باس قبول کر لیا) اسی لیے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر والدین کسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو تو ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے۔

خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ ----

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی ہے۔ لیکن اگر وہ تم سے اس کی کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک کر لو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو پھر ان کی اطاعت نہ کرو۔

محولہ بالا آیت سے واضح ہو گیا کہ اگر والدین اس قسم کے حکم دینے لگیں جو خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہوں تو وہاں ان کی فرماں برداری ختم ہو جاتی ہے ایسے امور میں خدا کے احکام کی بجا آوری ضروری ہوگی اور والدین سے صاف کہہ دینا ہوگا

کہ میں ان معاملات میں آپ کے احکام کی تعمیل سے قطعاً قاصر ہوں البتہ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اس کے بعد ہم ان سے حسن سلوک سے نہ پیش آئیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اس کو صاف کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ۔۔۔(31/15)

اگر ماں باپ تم سے یہ کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤ جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرو مگر دنیا میں ان کے ساتھ وہی برتاؤ قائم رکھو جو جانا پہچانا اور معروف ہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی کرو جو میرے قوانین کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے ہیں۔

لہٰذا دوسرے معاملات میں وہی جانا پہچانا برتاؤ کرتے رہنا چاہئے جو ایک شریف معاشرہ میں اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

دوسروں کی حق تلفی کے لیے والدین کی اطاعت نہیں کی جاسکتی:

ایسے ہی اگر والدین ایسے احکام دینے لگیں جن سے دوسرے اہل حقوق کی حق تلفی ہوتی ہو اور عدل وانصاف کے تقاضوں کا خون ہوتا ہو تو وہاں بھی والدین کے احکام کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ گھر میں ساس بہو، نندوں اور بھاوجوں اور دیورانی اور جٹھانی کی نہیں بنتی۔ ان صورتوں میں ساس اور سسر ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اس سے بہو کی حق تلفی بلکہ بسا اوقات اس پر ظلم ہونے لگتا ہے۔ ماں باپ کی عموماً یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ اولاد بھی ان کی اس روش کا ساتھ دے اور اس ظلم میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو۔ قرآن کی ہدایت ایسے معاملات میں یہ ہے کہ ایک مؤمن کو معاشرہ میں عدل وانصاف کو قائم کرنے والا ہونا چاہئے۔ اسے سمجھنا چاہئے کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک نگراں کی حیثیت رکھتا ہے اس میں خواہ اسے خود اپنی مرضی اور والدین اور اعزاء واقرباء کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ عدل وانصاف کی میزان کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل پیرا رہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ (4:135)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! عدل وانصاف کو قائم کرنے والے اور خدا کے لیے نگراں بن کر رہو، خواہ اس قیام اور نگرانی کی زد خود تمہارے اپنے والدین اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

بے عقلی کی باتوں میں والدین کی اطاعت نہیں کی جاسکتی:

جیسا کہ پہلے اجمالاً کہا جاچکا ہے والدین جب سن رسیدہ ہوجاتے ہیں تو بعض اوقات وہ ایسی بے عقلی کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ایک صاحب عقل وہوش آدمی نہیں کرسکتا وہ ایسے ایسے بے تکے احکام صادر کرنے لگتے ہیں جو سراسر خلاف مصلحت ہوتے ہیں۔ مشکلات ومصائب کی آماجگاہ بنا کر اسے اجیرن کردیتے ہیں۔ اولاد جب سن رشد کو پہنچ جائے اور اپنے بُرے بھلے کو خود سمجھنے لگے تو اسے محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے والدین کے احکام ہیں جانتے بوجھتے ایسے احکام کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ سن رسیدہ ہوجانے کی وجہ سے جہاں ان کے دیگر قوائے عملیہ انحطاط پذیر ہوجاتے ہیں۔ وہیں ان کے قوائے عقلیہ بھی بڑی حد تک مضمحل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے معاملات میں انسان کو خود عقل وہوش سے کام لے کر قدم اٹھانا چاہئے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿36:68﴾

اور ہم جن لوگوں کی عمریں لمبی کردیتے ہیں، پیدائشی طور پر ہم انہیں بالکل اوندھا کردیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے انسان پیدائشی طور پر اوندھا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بڑھاپے میں بالکل بچوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے یعنی وہ عقل سے کم کام لیتا ہے اور جذبات سے زیادہ، لہٰذا انسان کو اپنے معاملات کے فیصلے عقل وہوش کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔ والدین کے متعلق یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اب ان کے انحطاط کا زمانہ آگیا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہوں وہ عقل وشعور کا بھی تقاضا ہو۔ ان کی باتیں سنو اور عقل وشعور کی میزان میں ان کا وزن کرو۔ اگر ان کی ہدایات تقاضائے عقل کے مطابق ہوں تو خیر ورنہ سمجھ لو کہ یہ بیچارے معذور ہوچکے ہیں۔

والدین سے حسن سلوک اور کشادہ ظرفی کے سلسلہ میں قرآن نے حضرات انبیاء کرام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے۔

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿19:14﴾

وہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے والے تھے اور سرکش نہیں تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اعلان کیا کہ:

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿19:32﴾

خدا نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا بنایا ہے اور مجھے جبار اور بدبخت یا سنگدل نہیں بنایا۔

شکر:

انسان کے ہر عمل کا ایک مقصد اور نتیجہ ہوتا ہے۔ ماں باپ سالہا سال تک بچہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو مصائب جھیلتے رہتے ہیں ان کا بھی کوئی مقصد اور نتیجہ ہونا چاہئے اس کے کچھ تقاضے ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ سے بچہ پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہونی چاہئیں۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کی ان کوششوں اور مساعی کے بھرپور نتائج پیش کرے۔ قرآن والدین کے لیے شکر کا حکم دیتا ہے مگر شکر کے معنی یہ نہیں کہ زبان سے شکریہ ادا کر کے اولاد سبکدوش ہو جائے بلکہ شکریہ کے معنی ہیں پورے پورے نتائج مہیا کرنا ان جائز آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کرنا جن کے ماتحت اس کے ماں باپ ان مشکلات و مصائب کو جھیلتے آئے ہیں۔ ان کی اس سعی و عمل کی قدر شناسی کرنا جو انہوں نے اس کی صحیح تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کی ہے یعنی صحیح معنوں میں وہ کچھ بن جانا جو ایسی تعلیم و تربیت کا مقصد ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ (31:14)

ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق بھی حکم دیا ہے۔ جیسے ماں باوجودیکہ ضعیف پر ضعیف ہوتی جارہی ہوتی ہے مگر وہ اس کے حمل کی دشواریوں کو برداشت کرتی اور پھر دو سال تک دودھ پلانے کے بعد اس کا دودھ چھڑاتی ہے کہ وہ ہمارے انعامات اور والدین کے احسانات کی پوری پوری قدر شناسی کرے کیونکہ بہرحال انجام کے لحاظ سے ہمارے قانون ہی کی طرف ہر چیز کو لوٹنا ہوگا۔

اپنی محنت کے ماحصل کو والدین کے لیے کھلا چھوڑ دینا ضروری ہے:

اسلامی معاشرہ میں سرمایہ اندوزی تو جائز ہی نہیں۔ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھے اور جہاں ضرورت دیکھے وہاں اس کو صرف کر دے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں انسان اپنی محنت کے ماحصل کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کا امین ہوتا ہے۔ اسے اس میں سے اپنے لئے اتنا ہی لینے کی اجازت ہے جتنے کی اسے ضرورت ہو اور اس کے بعد جتنا کچھ اس کی ضرورت سے بچ جائے وہ ان لوگوں کا حق ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے مگر ان لوگوں میں سب سے مقدم ترین حق والدین کا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کے لیے ہمیں اپنی محنتوں کے

ماحصل کو کھلا رکھنا چاہئے۔ ان میں سب سے پہلے والدین ہی کو رکھا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (2:215)

اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ مفاد عامہ کے لیے کھلا چھوڑ دیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جو اموال تم کو مفاد عامہ کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں وہ والدین، قریبی رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے ہیں اور جو کچھ بھلائی تم کرتے ہو تو خدا اسے بخوبی جانتا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت نے جہاں یہ بتا دیا کہ کن کن لوگوں کے لیے ہمیں اپنے محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنا چاہئے اور ان کی ترتیب کیا ہونی چاہئے وہیں اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ تمہیں کن کن موقعوں پر خرچ کرنا ہوگا مگر اسے متعین کر کے نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنا کچھ خرچ کرنا ہوگا کیونکہ اس کا مدار حالات پر ہے جو بدلتے رہتے ہیں۔

والدین کے ساتھ سخت کلامی کرنا جائز نہیں:

بعض مرتبہ والدین اس عقلی انحطاط کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ بے تکی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان باتوں پر غصہ آجانا چاہئے۔ مگر اولاد کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھے اور آپے سے باہر ہو جائے۔ اسے یہ چیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی کبرسنی کی وجہ سے اس مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچ کر وہ معذور ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں عمداً نہیں کرتے۔ وہ اپنے نزدیک اسی کو عقل کا تقاضا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا نرمی اور ملاطفت کے ساتھ انہیں سمجھا دینا چاہئے اور عزت واحترام کے ساتھ ان سے گفتگو کرنی چاہئے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (17:23)

اور تیرے نشوونما دینے والے نے یہ حکم دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی بھی اطاعت وفرماں پذیری اختیار نہ کرو اور والدین کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑی عمر کو پہنچ جائیں (اور بڑھاپے کی وجہ سے بے عقلی کی باتیں کرنے لگیں) تو ان کو برا بھلا نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکو۔ بلکہ ان سے عزت واحترام کے ساتھ گفتگو کرو۔

(جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

درود شریف کا عملی مفہوم اور اس کے ثمرات

صدر اول میں جب مسلمانوں نے فتوحات حاصل کیں تو جس جس ملک کو انہوں نے فتح کیا۔ وہاں کی اکثریت نے اسلام کو بخوشی و رغبت دل سے قبول کیا اور اپنی اپنی زبانیں ترک کر کے انہوں نے عربی زبان اختیار کر لی۔ اس میں سارے شمالی افریقہ کے ممالک شامل ہیں۔ مثلاً مصر، سوڈان، لیبیا، ٹونیسیا وغیرہ سب اس میں آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عربی زبان مراکو تک چلی گئی۔ لیکن جب مسلمانوں نے مشرق کا رُخ کیا اور ایران کو فتح کیا تو اس وقت کے ایرانی مفتوح تو ہو گئے لیکن ان کو اسلام نے متاثر نہیں کیا۔ ان کو عربوں سے شدید نفرت تھی، اسی لیے انہوں نے نہ تو اپنی زبان چھوڑی اور نہ ہی عربی زبان اختیار کی۔ ہم جو کچھ بیان کر رہے ہیں یہ اس دور کے ایرانیوں کے متعلق ہے اس موجودہ دور کے ایرانیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فتح ایران سے اسلام کو جو نقصانات ہوئے، ان میں دو نقصان بہت نمایاں ہیں۔ اور ان دو نقصانات نے اسلام کو شدید نقصان پہنچایا کہ اس کی ہیئت ہی بدل کر رکھ دی۔ پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ ایرانیوں کی سازش سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اگر کسی سازش کے ماتحت حضرت عمرؓ کو شہید نہ کیا جاتا اور ان کی طبعی موت واقع ہوتی تو وہ مزید بیس سال اور کام کرتے اور اس طرح دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ ان کی شہادت سے اسلام کو جو نقصان ہوا اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مرتبہ و مقام کا کوئی دوسرا شخص مسلمانوں میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ فتحِ ایران سے اسلام کو دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ایرانیوں نے قرآن کریم کی ساری اصطلاحوں کو عربی کی بجائے فارسی میں ترجمہ کر دیا اور پھر ان اصطلاحوں کو وہ معانی پہنائے جن کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، تقویٰ، دین، طاغوت، جہاد، تزکیہ، مسجد، تسبیح، عبادت، تہجد، عمرہ، اعتکاف، ثواب، دعا، قیامۃ، الساعۃ، مغفرت، ذکر وغیرہ۔ اب اگر مسلمانوں کو قرآن کریم پر عمل کرنا ہے اور اپنی حالت کو سنبھالنا ہے تو اُن کے لیے از بسکہ ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان اصطلاحوں کو قرآنی مفہوم پہنائیں، تاکہ ان اصطلاحوں پر عمل کر کے، ان کے نتائج اس دنیا میں سامنے لائیں۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو اس میں اسی طرح تبدیلی آتی ہے۔ قرآن کریم

کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے، اس لیے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ البتہ ان اصطلاحوں کے معنی آسانی سے تبدیل کر دیئے گئے۔ ہم مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد سے مذہب پر عمل ہو رہا ہے۔ اس لیے کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ بڑے بڑے آئمہ ومفسرین اسی سازش کا شکار ہوئے۔ یہ تو مسلمانوں کی خوش بختی اور خوش نصیبی ہے کہ اس موجودہ دور میں تحریک طلوع اسلام برپا ہوئی اور اس نے اسی سازش کو Detect کیا۔ چونکہ یہ خالص دینی تحریک ہے، اس نے ان تمام اصطلاحات کو دینی مفہوم پہنائے۔

درود شریف فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ سورہ احزاب کی 56 ویں آیت سے ماخوذ ومستخرج کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا قرآنی مفہوم سمجھنے سے پیشتر آپ وہ سوالات اور ابہام زیر غور لائیں جو ہر شخص کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام ایک دینی تحریک ہے۔ اس کے نزدیک فرقہ بندی شرک ہے۔ اس تحریک کا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تحریک اصولی گفتگو کرتی ہے اور کسی کے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت درود شریف کا ''مذہبی مفہوم'' ہی سارے فرقوں میں رائج ہے۔ کسی ایک فرقہ میں بھی دینی مفہوم رائج نہیں۔ ہم درود کے ''مذہبی مفہوم'' پر جو گفتگو کریں گے، اس سلسلہ میں آپ اس نکتہ کو خیال شریف میں رکھیں۔

شیعہ اور سنی حضرات کے درود الگ الگ ہیں۔ چونکہ یہ دونوں فرقے اپنی اپنی نمازوں میں درود پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو دونوں فرقوں کے ہاں درود کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ الگ الگ دو طرح کے درود کا ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں درست نہیں ہوسکتے۔ ان دونوں میں سے ایک ہی درست ہوسکتا ہے۔

ہمارے ہاں چونکہ درود ہر شخص کو یاد ہوتا ہے اس لئے اُسے Quote کرنے کی ضرورت نہیں۔ سنی حضرات کے درود میں آل ابراہیم کا اضافہ ہوتا ہے جو شیعہ حضرات کے ہاں نہیں ہے۔ آل ابراہیم تو سارے بنی اسرائیل ہیں۔ شیعہ حضرات کا درود اللھم صل علیٰ محمد آل محمد ہے۔ اے اللہ تو محمد وآل محمد پر درود بھیج۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ درود شریف سلف صالحین سے چلا آرہا ہے۔ شیعہ حضرات نے اس میں آل کا اضافہ کیا اور اس کو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار دیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شیعہ حضرات اور بعد ازاں سُنی حضرات نے یہ درود کس طرح اختیار کیا کیونکہ یہ خود عربی قواعد کے خلاف ہے۔ کیونکہ اسم ضمیر پر اسم ظاہر کا عطف نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنے میں حرف جار کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ یعنی عربی قواعد کی رو سے آلہ کے اضافہ کے بعد درست درود یوں ہونا چاہئے۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ

شیعہ حضرات نے درود میں آلہ کا اضافہ کر کے، انہوں نے رسول اللہ اور ان کی آل کو ایک ہی ہستی قرار دے دیا ہے۔ ضمناً عرض ہے کہ روایت کے حوالوں کا تو ہمیں اندازہ نہیں، لیکن شیعہ علماء مجتہدین عام طور پر منبر پر آئمہ کے متعلق یہ حدیث بیان کرتے رہتے ہیں کہ اَوّلنا محمد، اوسطنا محمد، آخرونا محمد، وکلنا محمد، ترجمہ: ہمارا پہلا (امام) بھی محمد ہے، ہمارا درمیان کا بھی محمد ہے، ہمارا آخری بھی محمد ہے۔ ہم سب کے سب ہی محمد ہیں۔ اس حدیث کے ہوتے ہوئے آئمہ کرام کو درود میں شامل کرنے پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ اُن کے عقائد ہیں۔ تحریک طلوع اسلام کو ان حضرات کے عقائد سے کوئی تعرّض نہیں ہے ان دو طرح کے درودوں کے علاوہ اور بھی درود ہیں۔ جن میں درود تاج اور درود لکھی زیادہ مشہور ہیں۔ بعض حضرات آل کے علاوہ ازواج، اصحابہ اور ذریت کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ جب قرآن کریم سے سند لینے کی ضرورت ہی نہیں رہی، تو پھر آپ کو اختیار ہے جس کو چاہیں درود میں شامل کر لیں اور جس کو چاہیں اس سے خارج کر دیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کرام کے دل میں بھی یہ خلش موجود تھی کہ درود کی آیت میں تو صرف رسول اللہ کا ذکر ہے۔ یعنی علی النبی ہے۔ پھر اور حضرات درود میں کس طرح شامل ہو گئے۔ اس مسئلہ کی کشاد کے بارے میں معارف القرآن میں ارشاد ہوتا ہے ''اس معنی پر جو شبہ ہوسکتا ہے کہ صلوٰۃ میں تو روایات کے مطابق آپ کے ساتھ آپ کے آل واصحابہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور مدح وثنا میں آپ کے سوا کسی کو کیسے شریک کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب روح المعانی وغیرہ میں یہ دیا گیا ہے کہ تعظیم اور مدح وثنا وغیرہ کے درجات بہت ہیں۔ رسول اللہ کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے اور ایک درجہ میں آل واصحاب اور عام مومنین شامل ہیں'' اس اقتباس میں آل واصحاب کو شامل کرنے کی جو وجہ بتائی ہے، وہ آپ کو مطمئن کرتی ہے یا نہیں یہ تو اور بات ہے، البتہ یہ بات واضح ہے کہ ہمارے علماء کے دل میں یہ خلش ضرور موجود تھی۔

اس تفسیر میں درود کے الفاظ کے متعلق تحریر ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ''خود رسول اللہ سے دریافت کر کے الفاظ صلوٰۃ متعین کرائے۔ اسی لیے نماز میں عام طور پر انہی الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ کو اختیار کیا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی تعین نہیں جس سے تبدیلی ممنوع ہو۔ کیونکہ خود رسول اللہ سے صلوٰۃ یعنی درود کے بہت سے مختلف صیغے منقول و ماثور ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کے حکم کی تعمیل ہر اس صیغہ سے ہوسکتی ہے جس میں صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ہوں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ آنحضرتؐ سے بعینہٖ منقول بھی ہوں بلکہ جس عبارت سے بھی صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ادا کیے جائیں اس حکم کی تعمیل اور درود شریف کا

ثواب حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ خود آنحضرتؐ سے منقول ہیں وہ زیادہ بابرکت اور زیادہ ثواب کے موجب ہیں۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ نے الفاظِ صلوٰۃ آپ سے متعین کرانے کا سوال فرمایا تھا۔'' (معارف القرآن، جلد 7، صفحہ 223)

درود شریف کی اہمیت کے متعلق جامع ترمذی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ۔ ترجمہ: یعنی ذلیل ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے۔ الْبَخِيلُ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ ثُمَّ لَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ۔ ترجمہ: بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔'' تفسیر نمونہ میں تحریر ہے کہ امام شافعی اس فتویٰ کو اپنے اشعار میں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا اهلَ بَيتِ رَسولِ اللهِ حُبُّكُمْ
فَرضٌ مِنَ اللهِ وفي القُرآنِ أَنزَلَهُ
كَفا كُم مِن عظيمِ القَدرِ أَنَّكُم
مَن لَم يُصَلِّ عَلَيكُم لَا صَلَاةَ لَهُ

ترجمہ: اے اہل بیت رسول تمہاری محبت خدا کی جانب سے قرآن میں واجب قرار دی گئی ہے تمہارے مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ جو شخص تم پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل موضوع درود کی طرف رجوع کریں قرآن کریم کی ایک اور اصطلاح کی وضاحت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس اصطلاح کا درود کی آیات سے گہرا تعلق ہے۔ یہ اصطلاح ''اخراج من الظلمات الی النور'' ہے یہ اصطلاح قرآن کریم میں 7 مرتبہ 2:256، 14:1،2، 14:5، 33:43، 57:9، 65:11 آئی ہے۔ چونکہ ہمارے مفسرین کے سامنے واضح نہیں ہوسکی اور مختلف مفسرین نے اس کا مختلف مفہوم لیا ہے۔ لیکن عموماً مفسرین اس کا مطلب کفر سے نکل کر ایمان کی طرف جانا قرار دیتے ہیں۔ معارف القرآن میں تحریر ہے ''تا کہ حق تعالیٰ تم کو جہالت وضلالت کی تاریکیوں سے علم وہدایت کے نور کی طرف لے آئے۔ یعنی خدائی رحمت اور دعا ملائکہ کی برکت ہے کہ تم کو علم اور ہدایت کی توفیق حاصل ہے کہ یہ ہر وقت متجدد ہوتی رہتی ہے۔ جلد 7، صفحہ 171، حواشی عثمانی میں تحریر ہے ''یہ رحمت وبرکت ہے جو تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہالت وضلالت کی اندھیریوں سے علم وتقویٰ کے اجالے میں لاتی ہے۔''

لیکن جس شخص کے سامنے دین ہوگا وہ علماء کرام کی ان تشریحات سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے سامنے اس اصطلاح کے اصل معنی بالکل سامنے پڑے ہیں۔ ارشاد عالی ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ (14:5) ہم نے موسیٰ کو اپنے قوانین دے کر فرعون کی طرف بھیجا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14:5) کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو طاغوت کے اندھیروں سے نکال کر سینا کی وادی میں لے آئے جہاں انہوں نے دین کا نظام قائم کیا اور اپنی قوم سے فرمایا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (14:6) اللہ کا احسان یاد کرو جب اس نے تم کو آل فرعون سے نجات دی کہ وہ تمہیں بڑا عذاب پہنچاتے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کس طرح وضاحت کی کہ اس نے ان الفاظ کو طاغوت سے دین کی طرف آنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (2:256) ترجمہ خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لائے وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لایا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کا سرپرست شیطان ہے وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں ڈال دیتا ہے۔ طاغوت کے معنی بہت مرتبہ واضح کئے جا چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ نظام ہوتا ہے جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر مبنی ہوتا ہے اور ہم اپنی بول چال میں بھی عموماً ''طاغوتی نظام استعمال کرتے ہیں۔ اس آیت نے طاغوت اور نور کو ایک دوسرے کے مقابل پیش کیا ہے۔ اور آیت کے معنی واضح کر دئے۔ اللہ ایمان والوں کو طاغوت کے نظام سے دین کے نظام کی طرف لاتا ہے۔

قرآن کریم کے نزول کا سبب خود قرآن میں طاغوت سے نکال کر دین کی طرف لانا بتایا ہے۔ ارشاد حق تعالیٰ ہے كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14/1) قرآن: وہ کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تُو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ بالکل اسی مضمون کو سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (57/9) اللہ وہ ہے جو اپنے بندہ پر واضح آیات نازل کرتا ہے تاکہ وہ تم کو اندھیروں سے اجالے میں نکال لائے۔

(جاری ہے)

یاسر پیرزادہ

سوچنے کا فریم ورک قرآن کی نظر میں!

ایک عام مسلمان اپنی روزمرہ زندگی میں قرآن کی تلاوت کتنی مرتبہ کرتا ہے؟ ظاہر ہے اس بات کا اعداد وشمار پر مبنی کوئی حتمی جواب تو نہیں دیا جاسکتا مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی جو پورے اہتمام کے ساتھ ہر روز قرآن کے ایک رکوع کی تلاوت کرتے ہوں گے، اس سے بھی کم وہ لوگ ہوں گے جو اردو ترجمے کے ساتھ روزانہ قرآن پڑھتے ہوں گے، اور ان لوگوں کی تعداد تو شاید بہت ہی تھوڑی ہو جو قرآن کی کچھ آیات بمع تفسیر باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے ہوں گے، اور وہ خوش نصیب تو یقیناً آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے جو یہ سب کام کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کی آیات پر نہ صرف غور کرتے ہوں گے بلکہ ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتے ہوں گے۔ بظاہر یہ آخری کام مشکل لگتا ہے مگر خود قرآن کے الفاظ میں یہ ایسا مشکل بھی نہیں، ''ہم نے اسے (قرآن کو) سوچنے سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے!'' (مفہوم)۔ افسوس کہ قرآن کی اس دعوت کے باوجود ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اسے سمجھنے کی خود کوشش کرتے ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ خود قرآن نے اس ضمن میں ہمیں سوچنے سمجھنے کا ایک فریم ورک دیا ہے مگر ہم میں سے شاید ہی کبھی کسی نے اس پر غور کیا ہو۔ یہ فریم ورک کیا ہے؟ یہ سوچنے سمجھنے کا وہ طریقہ ہے جو قرآن نے انسانوں کے لیے وضع کیا ہے۔ جوں جوں میں نے اس پر غور کیا میں ورطہ حیرت میں ڈوبتا گیا، اس سے پہلے کبھی قرآن کے یہ معنی مجھ پر آشکار نہیں ہوئے تھے، شاید اسی لیے قرآن کا مطلب ''بار بار پڑھی جانے والی کتاب ہے'' کہ ہم اسے بار بار پڑھیں اور ہر مرتبہ نئے انداز سے فیض یاب ہوں۔ اب ذرا اس سوچنے سمجھنے کے فریم ورک پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

سوچ کا پہلا اصول قرآن نے یہ بتایا ہے کہ جن چیزوں کا ہمیں علم نہ ہو ان کے بارے میں سنی سنائی باتیں پھیلانا درست نہیں، حوالہ ہے سورۂ بنی اسرائیل، آیت نمبر:36 ''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ

ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہوگی۔'' مولانا مودودی نے اس آیت کی تشریح یوں کی ہے کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہم وگمان کی بجائے ''علم'' کی پیروی کریں۔ اگر ہم اس ایک آیت پر عمل کرنا شروع کردیں تو حیرت انگیز نتائج نکلیں گے۔ مثلاً آئے روز ہم مختلف مکاتب فکر کے مولوی حضرات کی باتیں سنتے ہیں، ان میں سے بیشتر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے قرآن وحدیث اور مختلف تاریخی کتب کا حوالہ بھی دیتے ہیں، کیا ہم میں سے کبھی کسی نے یہ کوشش کی کہ جس قرآنی آیت یا حدیث کا حوالہ دیا جارہا ہے ذرا زحمت کرکے اسے خود نکال کر پڑھ لیں؟ میں تو اکثر یہ کام کرتا ہوں اور کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ جو حوالہ دیا گیا ہوتا ہے اس کا مفہوم اس بات سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کوئی ''عالم'' ہمیں بتا رہا ہوتا ہے۔ یہ کام کرنا کوئی ایسا مشکل نہیں کیونکہ اب تو قرآن وحدیث کے ایسے سافٹ ویئر دستیاب ہیں جن کی مدد سے آن واحد میں آپ متعلقہ آیات اور احادیث کا نہ صرف اصل متن بلکہ ترجمہ اور تشریح بھی پڑھ سکتے ہیں، ایک سافٹ ویئر ہے "Easy Quran and Hadees" " جو انٹرنیٹ پر مفت میسر ہے جس کی مدد سے آپ یہ کام بآسانی کرسکتے ہیں، اس سافٹ ویئر میں آپ کوئی بھی لفظ ڈالیں، مثلاً ''زکوٰۃ'' تو یہ آپ کو زکوٰۃ سے متعلق تمام آیات، احادیث بمع ترجمہ وتفسیر پیش کردے گا، گویا بنیادی ماخذ آپ کے سامنے۔ اب کسی سنی سنائی بات پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں اور یہی قرآن کا حکم ہے۔

قرآن نے سوچنے کا دوسرا اصول ہمیں یہ بتایا ہے کہ انسان کو جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے سوچنا چاہئے، حوالہ سورہ الفرقان، آیات نمبر:72 اور 73 (اور رحمان کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوجائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے ربّ کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر جاتے۔'' یہ ایسی خوبصورت آیات ہیں مگر شاید ہی آپ نے کسی عالم دین کو ٹی وی پر اس کی تشریح بیان کرتے سنا ہو! اس آیت میں خدا اپنے بندوں کی نشانی یہ بیان کررہا ہے کہ اگر انہیں خدائی احکامات بھی سنائے جاتے ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے بن کر عمل کرنے میں نہیں جت جاتے، گویا غور کرتے ہیں اور پھر ان پر عمل کرتے ہیں، یعنی اللہ ہمیں یہ تلقین کررہا ہے کہ مذہب کے معاملات میں بھی عقلی استدلال سے کام لیا جائے نہ کہ لوگوں کے جذبات سے کھیل کر انہیں

راغب کیا جائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انسان جذبات کے تابع ہو کر سوچتا ہے تو بہت سارے حقائق اسے نظر آنا بند ہو جاتے ہیں، اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے، وہ سچائی سے دور ہو جاتا ہے او ریوں اسے حقیقت کا ادراک نہیں ہو پاتا اور یہی وہ المیہ ہے جس کا ہم شکار ہیں۔

سوچنے کا تیسرا اصول جو قرآن سے اہم اخذ کر سکتے ہیں وہ تخلیقی سوچ کو روایتی سوچ پر ترجیح دینا ہے، سورہ احزاب کی آیت نمبر:66، 67 اور 68 میں اللہ فرماتا ہے ''جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کر دیئے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ'' کاش ہم نے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کی ہوتی۔'' اور کہیں گے'' اے ربّ'' ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے ربّ ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔'' اس کے بعد سورہ سباء کی آیت نمبر:46 میں اللہ فرماتا ہے'' اے نبی ﷺ ان سے کہو کہ، میں تمہیں بس ایک نصیحت کرتا ہوں، خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے صاحب (مراد رسول اللہ ﷺ) میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔'' گویا سورہ احزاب میں خدا نے روایتی انداز میں سوچنے والے ان لوگوں کو، جنہوں نے اپنے ذہنوں کو محض اس لیے بند کر لیا تھا کہ ان میں اپنے سرداروں سے اختلاف کرنے کی جرات نہیں تھی، کا انجام بیان فرمایا ہے کہ جب آگ سے ان کے چہرے الٹ پلٹ کئے جائیں گے تو وہ اس وقت یہ تاویل دیں گے، جبکہ دوسری طرف سورہ سباء میں اللہ تخلیقی سوچ کو ابھارنے کا حکم دے رہا ہے کہ ہمیں اپنا دماغ لڑانا چاہیے اور سوچنا چاہیے، کیا out of box thinking اسی کو نہیں کہتے؟

آج جن قوموں نے قرآن کے بیان کردہ یہ آفاقی اصول اپنا رکھے ہیں وہ ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں اور مسلمان جن پر اللہ نے اپنی یہ کتاب نازل کی، ان زریں اصولوں پر عمل کرنے کو تیار نہیں، دنیا میں تو ہم رسوا ہو ہی رہے ہیں، آخرت میں خدا ہم پر رحم کرے، آمین۔

نوٹ: یہ کالم میرے ایک قاری جناب ممتاز خان (قرآن اینڈ تھنکر زفورم، کینیڈا) کی ایک ای میل سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور 28 جون 2015)

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

کیا رویت ہلال کمیٹی کو ختم کر دینا چاہیے

پہلے ہم دو عیدوں کو روتے تھے۔ اب دو دو رمضان بلکہ کئی رمضان؟ ایک رمضان جمعرات 18 جون کو شروع ہوا۔ دوسرا 19 جون کو شروع ہوا۔ سارے عالم اسلام میں پہلا روزہ 18 جون جمعرات کو تھا مگر رویت ہلال کمیٹی کے مفتی منیب الرحمٰن سیاستدان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے اختیار کو استعمال کیا اور پہلا روزہ جمعہ کو کر دیا۔ اب سب پاکستانیوں کو ان کا حکم ماننا ہے۔ ان کا حکم صرف رمضان اور عید کے لیے چلتا ہے۔

پورے پاکستان میں جمعے کو روزہ ہو یا رویت ہلال کمیٹی کو توڑ دیا جائے۔ اگر پشاور کی مسجد قاسم علی کے مولانا پوپلزئی کو چاند دیکھے جانے کی شہادت مل گئی ہے تو مفتی منیب الرحمن کو کیوں نہیں ملی۔ معذرت سے عرض ہے کہ دونوں میں سے ایک تو غلط ہے جبکہ دونوں اپنے آپ کو سچا مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سچے تم بھی ہو مگر میرا سچ تیرے سچ سے مختلف ہے۔

مفتی منیب صاحب تو اس پر بھی ناراض ہوئے کہ ہمارا اجلاس محکمہ موسمیات کے دفتر میں کیوں بلایا گیا۔ ہمیں اپنا دفتر کیوں نہیں دیا جاتا۔ ہم سارا سال ماہ رمضان اور عید کا چاند دیکھنے کے لیے تیار ہیں۔ مفتی صاحبان اور مولوی صاحبان بہت سرگرم اور اہم ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی کو آج کا اخبار لانے کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا کہ جناب میں کل سے آج کا اخبار ڈھونڈ رہا ہوں نجانے کہاں چلا گیا؟

مسجد قاسم علی پشاور کے مولانا پوپلزئی کو رویت ہلال کمیٹی کا صدر کیوں نہیں بنا دیا جاتا۔ جب ہر محکمے کے لیے ایک معیار مقرر ہے تو اس میں بھی ہونا چاہئے۔ مولانا پوپلزئی کو اے این پی والے بلور صاحبان اور میاں افتخار بہت پسند کرتے ہیں۔ جب وہ حکومت میں تھے تو باقاعدہ پہلی رمضان سے پہلے مولانا کو بہت پروٹوکول دیتے تھے۔ جو بات پاکستان کے اتحاد کے اور مفاد کے خلاف ہو انہیں بہت اچھی لگتی ہے۔

میاں افتخار حسین کا بیٹا شہید ہوا انہیں تھانے میں حوالات کی ہوا کھانا پڑی۔ ہمیں ان کا رویہ اچھا لگا تھا۔ وہ

مقتول کے گھر بھی گئے جبکہ تحریک انصاف والوں کو یہ توفیق نہ ہوئی مگر دو دن بعد خیبر پختونخواہ حکومت کے استعفیٰ کے لیے خود میاں صاحب اپنے غنڈوں کے ساتھ زبردستی دکانیں بند کروا رہے تھے تو اچھا نہیں لگا۔ اس مظاہرے کا کیا بنا؟ میاں افتخار کو اب میاں نواز شریف کو جائن کر لینا چاہئے۔

جس حکومت نے تفرقے سے بچنے کے لیے رویت ہلال کمیٹی کی نگرانی کر رکھی ہے کیا وہ پشاور کے مولانا پوپلزئی سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ اس معاملے میں رمضان اور عید کا اعلان کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ وہ ہر دفعہ مسکراتے ہوئے مذاق اڑانے کے انداز میں مفتی منیب کے اعلان سے ایک دن پہلے رمضان اور عید کا اعلان کر دیتے ہیں۔ انہیں احساس نہیں کہ پشاور میں بھی پچھتر فیصد سے زیادہ لوگ روزہ نہیں رکھتے۔ پورے پاکستان میں جمعے کو روزہ ہے مگر ہر سال اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا لیتے ہیں۔ اسے اینٹ سے اینٹ بجانا بھی کہہ سکتے ہیں۔ آج جمعے کو ''صدر'' زرداری نے اپنی صف آرائی کرنے کے لیے افطار ڈنر کر رکھا ہوا ہے۔ مولانا پوپلزئی اس کے خلاف احتجاج کریں مگر ان کے کرم فرما لیڈر اسفندیار ولی تو جا رہے ہیں۔ ان کا روزہ نہیں ہوگا۔ مگر وہ افطار ڈنر ضرور کریں گے اور سیاسی فرقہ واریت کے لیے کوئی نہ کوئی بیان بھی دے دیں گے۔ میری گذارش ہے کہ چوہدری شجاعت نہ جائیں۔ وہ بہت سیانے اور سیاست کے عقلمند ترین آدمی ہیں۔ انہیں چوہدری پرویز الٰہی روک لیں۔ انہیں کہیں کہ روٹی شوٹی آج گھر ہی کھالیں اور دوسروں کو کھلائیں۔ انہوں نے جنرل مشرف کو اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگیوں کو اکٹھا کر کے خود ''صدر'' بننا چاہتے تھے۔ مشرف نے چوہدری صاحبان کے ساتھ دھوکہ کر کے اپنے آپ سے اچھا نہیں کیا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنوا دی؟

مجھے لگتا ہے کہ یہ رویت ہلال کمیٹی اسلامی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اب یہ رواج پڑ گیا ہے کہ ہم ہر بات میں اسلامی اور غیر اسلامی لے آتے ہیں۔ یہ کمیٹی ایسی ہی کمیٹی ہے جو حکومتیں جان چھڑانے کے لیے بناتی رہتی ہیں۔ یہ بھی ریاستی یا حکومتی یا سرکاری رویت ہلال کمیٹی ہے۔ پہلے ہر بستی کی اپنی عید ہوتی تھی۔ ہر بندہ چاند دیکھتا تھا اور لوگ اس کے مطابق اپنے شہر میں روزہ رکھتے تھے۔ اب تو جیسے روزہ بھی سرکاری ہو گیا۔

سنا ہے اس بار جس سٹیج پر کھڑے ہو کر مفتی منیب اور مفتی صاحبان چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ ان کے بوجھ تلے آ کے ٹوٹ گیا۔ مفتی منیب گرتے گرتے بچے۔ ان بزرگ قابل احترام لوگوں کو چھت پر کھڑا چاند نہیں نظر

آتا۔ انہیں فضاؤں میں چند لمحوں کا مہمان چاند کیسے نظر آئے گا۔ حیرت ہے کہ اس ٹیکنالوجی کے زمانے میں جب سب کچھ انسان کی ہتھیلی پر آ گیا ہے۔ ہم چاند دیکھنے کا روائتی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہم کہ اختیار سے واقف ہیں نہ بے اختیاریوں سے واقف ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔ ہم خود اپنا مذاق اڑواتے ہیں۔

ہم جب حج سعودی عرب کے مطابق کرتے ہیں تو پہلا روزہ اس کے ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتے۔ عید کیوں نہیں منا سکتے۔ سعودی عرب میں حج کے دوسرے دن پاکستان میں حج منایا جا رہا ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ؟ سارے عالم اسلام میں ایک ہی دن ہمارے سارے تہوار ہونا چاہئے۔ پیغمبر برحق حضرت یسوع مسیح کا یوم ولادت کرسمس 25 دسمبر کو ہوتا ہے۔ چیزیں بھی سستی ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں رمضان میں کیا حال ہوتا ہے۔ مہنگائی کا ایک طوفان آیا رہتا ہے۔ کئی لوگ رمضان میں کمائیاں کر کے دو مہینے بعد حج پر چلے جاتے ہیں اور کئی حج بڑے خضوع وخشوع سے کرتے ہیں اور الحاج کہلواتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب جمعے کے خطبے میں بتا رہے تھے کہ لاکھوں حاجیوں میں سے کسی کا حج قبول نہیں ہوا تھا۔ مگر اس آدمی کی وجہ سے سب کا حج قبول ہو گیا۔ جس نے حج کیا بھی نہ تھا۔ عراق میں کسی موچی نے عمر بھر پیسہ پیسہ جوڑا کہ حج کرے گا۔ حج پر روانگی سے پہلے وہ ہمسائے میں گیا تو وہاں بچے رو رہے تھے۔ پوچھا کہ کیا ہوا تو بیمار عورت نے کہا انہوں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا۔ موچی گھر گیا اور حج کے لیے جمع کی ہوئی ساری رقم لا کے اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دی اور گھر جا کر اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگ گیا۔

دل بدست آرد کہ حج اکبر است

لوگوں کے دل جیت لو کہ یہی حج اکبر ہے۔ محبتیں بانٹو کہ یہی نیکی ہے۔ لوگوں کو معاف کرو اور معافی مانگتے رہو کہ یہ اللہ کو بہت پسند ہے۔ پہلا روزہ کسی نے جمعرات کو رکھا یا جمعے کو رکھا اسے جزا ملے گی مگر ان لوگوں کو سزا کب ملے گی جو انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں اور دین کے نام پر تقسیم کرتے ہیں۔ ہمارا میڈیا اس میں برابر کا شریک ہے کہ انہوں نے مفتی منیب الرحمٰن کی اور مولانا پوپلزئی کی تقریر برابر برابر دکھائی اور لوگوں کو پریشان کیا۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 20 جون 2015ء)

ڈاکٹر انعام الحق۔ اسلام آباد

باب المراسلات

لَیلَۃ القَدر کا قرآنی مفہوم اور اہمیت

آج رمضان کے اکیسویں روزہ کے ساتھ آخری عشرے کا آغاز ہو گیا ہے اور لوگ لیلۃ القدر کی آمد اور اُس کے منانے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔ لہٰذا مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں احباب کے سامنے اس کا ایک تحقیقی، علمی اور منطقی اصولوں پر مبنی ایک مُمکنہ مفہوم بھی رکھ دوں، جس کا میں نے مُحترم پرویز صاحب کے دئے گئے ہفتہ وار دروس القرآن سے اختصار سے انتخاب کیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۟ (97:1)

ہم نے قرآن کے نزول کا آغاز اس تاریکی والے دور میں کیا، جب ساری دنیا وحی کی روشنی میں دی گئی اقدار سے محروم تھی۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ تاریکی میں چیزوں میں امتیاز نہیں رہتا، گدھا گھوڑا اور نشیب و فراز سب برابر ہوتے ہیں۔ ایسے دور میں جب تاریکی کی وجہ سے چیزوں میں امتیاز ختم ہو جاتا ہے، تو امتیاز کرنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ روشنی اقدار خداوندی ہیں، جن کا مقصد ہی یہ بتایا کہ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (14:1)

''ہم نے یہ قرآن اس لئے دیا تا کہ تو اپنے نشوونما دینے والے رب کے طریق کے مطابق انسانوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ (14:5-43:33) اور اُن کے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق، اُنہیں اللہ کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حُسن و قوت کا مالک ہے۔ (1:64)

یعنی نزولِ قرآن کے وقت انسانیت تاریکی میں تھی، قرآن کریم کی راہنمائی انہیں روشنی میں لے آئی۔ اس جہت سے، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن دُنیا کو ملا، لیلۃ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں ہر طرف

تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ روشنی کا نام ونشان تک نہیں تھا- پھر، روشنی کی تکمیل اس طرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا۔ اوراب قرآن کے فرمان کے مطابق

5۔ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (97:5)

امن وسلامتی کی فضا عام ہوتی جائے گی حتیٰ کہ تاریکیاں دور ہو جائیں گی، اور آخر الامر، زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ (83/6، 39/69)۔

لَيْلَةِ الْقَدْرِ: اگر کوئی پوچھے کہ ایک فقرے میں بتاؤ کہ قرآن نے انسانیت کو کیا دیا ہے، تو جواب میں قرآن ہی کا فقرہ ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ قرآن نے انسانیت کو مستقل اقدار Permanent Values دی ہیں، جو انسان کو انسان بناتی ہیں۔

الْقَدْرِ: حیوانی سطح پر اقدار Values نہیں ہوتیں۔ حیوانوں کے سامنے تو صرف ان کے طبیعی تقاضے ہوتے ہیں۔ اقدار Values صرف انسانیت کی سطح پر آتی ہیں۔ حیوان کے سامنے جو بھی کھیت یا چراگاہ آئے گی وہاں سے پیٹ بھر لے گا۔ وہ اس بات کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا کہ جہاں سے چر رہا ہوں، وہ کسی دوسرے کا کھیت ہے یا کسی دوسرے کی چراگاہ ہے، کیونکہ اس کا مقصد تو صرف اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ جائز و ناجائز، ثواب و گناہ، صحیح و غلط، حلال و حرام، میرا اور تیرا کا امتیاز انسانی دنیا میں ہے۔ ان ہی امتیازات کو اقدار یا Values کہا جاتا ہے۔

لہٰذا القدر سے مراد وہ اقدار Values ہیں، جو خدا نے انسان کو انسان بنانے کے لئے قرآن میں محفوظ کر دی ہیں۔ اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کی ذات کی نشو ونما ہوتی چلی جاتی ہے اور انسانی ذات اخروی زندگی میں مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

جہاں تک دوسرے لفظ ''لیل'' کا تعلق ہے تو دن روشنی کا نمائندہ ہوتا ہے، جبکہ لیل یعنی رات تاریکیوں کی نمائندہ ہوتی ہے۔ لیل کے معنی تو یہی رات ہوتی ہے، جس میں ہم نیند بھرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ قرآن رات ہی میں نازل ہونا شروع ہوا ہو، لیکن یہاں ''لیل'' زیادہ وسیع تر مفہوم لئے ہوئے ہے، کیونکہ نزول قرآن سے پہلے دنیا پر تاریکیاں ہی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ عربوں کی طرف تو حضرت اسماعیل کے بعد کوئی نبی آیا ہی نہیں تھا۔ حضرت اسماعیل نے جو تعلیم پیش کی تھی، اس کو عرب بھلا چکے تھے۔ حضرت اسماعیل کو گزرے ہوئے بھی ایک بہت

لمبا عرصہ گزر چکا تھا۔ دوسری اقوام کی طرف انبیاء کرام آتے رہے، لیکن وہ تمام، اپنے انبیاء کی تعلیم کو نہ صرف بھلا چکے تھے، بلکہ مسخ بھی کر چکے تھے۔

نزول قرآن کے وقت دنیا میں اقدار خداوندی کہیں موجود نہ تھیں، اور اگر کہیں کوئی اکا دکا تھیں بھی تو ان پر انسان عمل نہیں کر رہا تھا۔ لہٰذا ''لیل'' سے مراد وہ تاریک دور ہے، جسمیں اقدار خداوندی موجود نہ تھیں۔ انسانیت پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

فیس بک پر درجِ بالا پوسٹ کو طویل اور سنجیدہ ہونے کے باوجود احباب کی طرف سے بھرپور تحسین و تعریف کے پیغام وصول ہوئے اور درجن بھر احباب نے اِسے اپنے اپنے احباب کو شیئر بھی کیا- اس پر معمول کے مطابق کُچھ اعتراضات بھی کئے گئے۔ جن میں زیادہ تر اسے بغیر اسلاف کی سند سے نئے معانی پہنانے کے مترادف کے الزام سے گردانا گیا۔ لہٰذا ان اعتراضات کی نمائندگی میں یہ اعتراض درج کر کے سبھی کے سوالات کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔

اعتراض:

اب دیکھیں پرویز صاحب کی یہ تفسیر جو انہوں نے لیلۃ القدر کو تاریک دور کہا ہے لیلہ رات کو کہتے ہیں القدر عزت والی۔ آگے یہ بھی کہا ہے وہ ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور اس رات عبادت کرنے کی فضیلت رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے اور وہ آخری عشرے میں ہے، جن لوگوں کے سامنے قرآن نازل ہوتا تھا اور جن کی مادری زبان میں نازل ہوتا تھا انہوں نے یہ تفسیر نہیں کی اور پرویز صاحب یہاں لیلۃ القدر کی وہ تفسیر کر رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے خود نہیں کی نہ ابن عباس نے کی نہ کسی اور مفسر نے اور نہ ہی عرب میں لیل کو تاریک دور کو کہا جاتا رہا ہے؟؟

جواب:

محترم پرویز صاحب کے متعلق اِس قسم کے اعتراض کرتے وقت شائد معترض محترم پرویز صاحب کے فہمِ قرآن کے موقف سے آگاہی حاصل نہیں کر سکا۔ یہاں ہم معترض کے علاوہ دوسرے احباب کو محترم پرویز صاحب کے فہمِ قرآن کے اصولوں کے ضمن میں اُن کے موقف سے اُن ہی کی زبان سے آگاہ کر رہے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اسے اُن کے خیالات سے مُستفید ہوتے وقت اپنے ذھن میں رکھ کر صحیح فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے۔

قرآن کریم پر غور و فکر اور تدبّر کرنے کے متعلق تین بنیادی اصول:

(۱) عربی زبان کے ہر لفظ کے متعدّد معنی ہوتے ہیں، لیکن وہ متعدّد معنی اس لفظ کے ایسے مرادفات نہیں ہوتے کہ ایک کی جگہ دوسرا مرادف رکھ دیا جائے تو معنی بالکل وہی رہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کی شاعری ہے، جس میں شہد کی جگہ انگبیں کہہ دیا جائے تو معنی میں فرق نہیں پڑتا، لیکن عربی میں لفظ کے سینکڑوں مرادفات ہونے کے باوجود معنی میں فرق ہوتا ہے، اس لئے ایک لفظ کی جگہ اس کے مرادفات میں سے کوئی لفظ بعینہٖ انہی معنوں میں دوسری جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ مرادفات قرآن کریم میں آئے ہیں۔ تدبّر کرنے والے کو دیکھنا یہ ہوگا کہ ان معنی میں سے کون سا معنی اس مقام سے مطابقت رکھتے ہوئے موزوں ہوگا، جسے لیا جائے۔

(۲) دوسرا طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ قرآن کریم کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ ایک چیز کو مختلف مقامات پر دہراتا ہے۔ اگر قرآن میں ایک چیز کے بار بار آنے والے تمام مقامات کو سامنے رکھ لیا جائے، تو ہر مقام پہ اس کے معنی خود متعیّن ہو جاتے ہیں۔ تدبّر کرنے والے کے لئے انتخاب کرنا ضروری ہے کہ جو لفظ سامنے آیا ہے، تصریفِ آیات کے تحت اس کے جو معنی قرآن کے دیگر مقامات پر آئے ہیں، ان میں سے کون سا معنی اس مقام پر، اس لفظ کے لئے موزوں ہے، جسے اختیار کیا جائے۔ تدبّر کرنے والے کے پاس:

a) ایک تو لفظی معنی کی سند، زبان کے اعتبار سے یا لغوی اعتبار سے ہونا چاہیے، اور

b) دوسرے، جو معنی اس نے منتخب کیے ہیں، اس کی سند یہ ہو کہ قرآن کے دوسرے مقام پر وہ منتخب معنی استعمال ہوئے ہوں۔

c) تیسرے یہ کہ قرآن کریم کی من حیث الکل بھی ایک تعلیم ہے، اس لئے منتخب کردہ معنی قرآن کی کُلّی تعلیم کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔

مثلاً قرآن علم کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی کُلّی تعلیم کا اصول ہے، اس لئے کوئی ایسے معنی نہیں لئے جائیں گے، جس سے جہالت کی تعریف ہوتی ہو، کیونکہ یہ بات قرآن کی کُلّی تعلیم کے خلاف چلی جائے گی۔

یہ ہوسکتا ہے کہ تدبّر کرنے والا ایک وقت میں اپنے تدبّر سے ان معنی میں سے کسی ایک معنی کو لے۔ لیکن انسان کی بڑھتی ہوئی فکر سے تدبّر کی نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ کسی مقام پہ اس نے دیکھا کہ پہلے معنی سے یہ دوسرے معنی

زیادہ موزوں نظر آتے ہیں، تو وہ دوسرے معنوں کو اختیار کر سکتا ہے اور اسے اختلاف نہیں کہا جائے گا۔

پھر دہرایا جاتا ہے کہ

(۱) تدبّر کرنے والا، جو معنی لے رہا ہے، زبان کے اعتبار سے یا لغت کے اعتبار سے کیا وہ معنی عربوں کے ہاں مستعمل تھے؟

(۲) کیا منتخب معنی کی قرآن کریم کے دوسرے مقام سے تائید ہوتی ہے؟

(۳) قرآن کریم کی مِن حیث الکل بھی ایک تعلیم ہے، اس لئے منتخب کردہ معنی قرآن کی کُلّی تعلیم کے خلاف نہیں ہونے چاہئیے۔

یہ ہیں تدبّر فی القرآن کے اصول۔ بات دراصل ترجیحات کی ہوتی ہے کہ تدبّر کرنے والے کے نزدیک ترجیحات کون سی ہیں کہ معنوں میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر کوئی دوسرے معنی لیتا ہے تو یہ بات اس کے ساتھ جھگڑنے کی نہیں، بشرطیکہ اس کے پاس اوپر درج تینوں سندات موجود ہوں۔

یہ کوئی سند نہیں کہ ''فلاں مفسر، فلاں محدث نے یہ لکھا ہے''۔ کسی تدبّر کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ مزید شواہد سامنے آنے کے باوجود اپنے اسی پہلے معنی پر اٹکا رہے۔ اس پر لازم ہے کہ نئے انکشافات سامنے آنے کے بعد، اگر دوسرے معنی لینے کی گنجائش ہو، بشرطیکہ وہ تینوں شرائط پر پورا اترتا ہو، تو خود ہی معنی تبدیل کر دے۔ علم انسانی بڑھتا رہتا ہے اور نئے نئے انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں، اس لئے کسی ایک دور کا تدبّر قرآن بھی قیامت تک کے لئے حرفِ آخر نہیں۔ ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ ان سندات کے ساتھ خود تدبّر کرے۔

عربوں کے ہاں الفاظ کے لغوی معنوں کے ساتھ، ان کے وہ مجازی معنی بھی عربی لغات میں مل جاتے ہیں، جو نزول قرآن کے وقت مراد لیے جاتے تھے۔ جو مجازی معنی ہوتے ہیں، وہ کسی خاص دور تک محدود نہیں ہوتے۔ جہاں اپنے دور کی علمی سطح پر بات کو سمجھانا مراد ہو تو وہاں مجازی معنی ہی لئے جاتے ہیں، لہٰذا جوں جوں دنیا میں اور انکشافات ہوتے جائیں گے، انقلاب آتے جائیں گے، مجازی معنی کی فہرست اور زیادہ لمبی ہوتی چلی جائے گی۔

قرآن کے محکمات چٹان کی طرح اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ قرآن نے اپنی آیات کو محور کہا ہے۔ محور وہ شے ہے جو اپنے مقام پہ کھڑی ہو اور ہر چیز اس کے گرد گھومے۔ قرآن کے حقائق محور ہیں، چٹان ہیں، جو اپنے مقام پہ

کھڑے ہوئے ہیں اور انسان کا تدبّر وتفکّر ان کے گرد گھومتا رہتا۔ رہے گا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا چلا جائے گا، تدبر کی راہیں بھی کشادہ ہوتی چلی جائیں گی۔ قرآن نے خود بتایا ہے کہ:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53)

انفس وآفاق میں جو ہماری علامات ہیں، ہم ان پر سے پردے اٹھاتے چلے جائیں گے تو ہر پردہ اُٹھنے کے بعد، جو بات سامنے آئے گی وہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا وہ حق ہے۔

لہٰذا پردوں نے تو ہر دور میں اٹھنا ہے، کیونکہ کسی ایک دور میں سارے پردے نہیں اٹھا کرتے۔ دنیا جتنی علم میں آگے بڑھے گی اتنے ہی پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔ ہمارا دور اس بات پر شاہد ہے کہ پہلے ہزار سالوں میں بھی اتنی تبدیلیاں، انقلابات اور انکشافات نہیں ہوتے تھے جتنے ہمارے دور میں ہو رہے ہیں۔ آج کا دور بڑا تیز ہوگیا ہے۔ انسان کے علم کی ترقی کی رفتار بڑی تیز ہوگئی ہے۔ لہٰذا اسی اعتبار سے قرآن کے معنی، مفاہیم، انکشافات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کے مفاہیم کو اوپر درج تین سندات پر پرکھا جائے گا تو پھر کوئی تعرض یا مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی کا سمجھا ہوا قرآن، کسی دوسرے کے لئے سند نہیں ہوسکتا۔

اخیر میں مَیں اپنی طرف سے وضاحت میں یہی اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ہمیں بھی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ کی تیاری میں ایسے ہی قواعد کو منطقی اور علمی پیمانہ پر پوری طرح منطبق ہونے کی بنا پر انہی جیسے اصولوں سے مُستفید ہوتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف سے مقالہ کی تیاری کی خصوصی ہدایات دی جاتی تھیں۔ اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ پُرانی بات کو نئے پیرائے میں اخذ کرتے ہوئے باقاعدہ مُستند اسناد کے حوالہ جات دیتے ہوئے ایک نئی تخلیق کے طور پر سامنے لایا جائے۔

اشتہار ضرورتِ رشتہ

ایک پاکستانی نژاد انگلستان کے شہری عمر 34 سال جو کہ یو۔کے میں کاروبار کرتے ہیں کے لیے پاکستان سے دینی اقدار کی حامل خاتون کا رشتہ درکار ہے۔ درجِ ذیل نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ 0321-4436331

Surah *'Abasa* (عبس)–*Durus-al-Qur'an Parah 30*: Chapter 9

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is July 13, 1984 and today's lecture starts with Surah *'Abasa*(عبس) once again. This is 80th Surah of part (جز) 30 of the Quran. I had presented its preface in the last lecture and today's lecture is intended to complete that preface. This led to the discussion of event-based revelation or *Shaan-e-Nuzool* (شان نزول). We also saw what really the process of understanding the Quran is. If one could internalize this point then one would be able to understand the Quran on your own.

Why did this—event-based revelation or *Shaan-e-Nuzool* (شان نزول)—happen after all?

I had mentioned that whatever roadblocks and obstacles that were put in the path of the Quran; whatever conspiracies were hatched against the Quran – one of them was the idea of event-based revelation called *Shaan-e-Nuzool* (شان نزول) which provides details of the event and the names involved. The Quran does not give such details. It was all done based on oral narrations.

When one critically examines these narrations pertaining to *Shaan-e-Nuzool* (شان نزول) one comes to the conclusion that these seem to be fabrications based on fiction. If you look into the history of narrations you will find that this had become common practiceand it was easy for anyone to come up with narrations. Jews and the Christians were doing it. So were the hypocrites. So were the proponents of *Shaan-e-Nuzool* (شان نزول) in large measure. And these fabricated narrations were used to compile interpretations and translations of the Quran. Please remember! If one wants to understand any verse of the Quran, then first, one should see what the traditional translation and interpretation of the verse says. Then ponder on that translation and interpretation. The problem is that we

do not ponder on the traditional translations and interpretations (تفسیر *Tafsir*) that have come down from our ancestors. And we are asked to follow them without question. My dear friends, this is not right. The Quran has made it obligatory on everyone to ponder in the Quran using all the Allah-given powers of consciousness, intellect, thought, knowledge, understanding, and wisdom. The Quran is not for a particular time or for a particular group of people. This is for our guidance and it is eternal guidance for all time until the Day of Judgment. Everyone is required by the Quran to ponder in the Quran. So, first, this requires us to ponder in what has been traditionally passed on as its translation and interpretation. If one finds that it is right then one should accept it, not because someone in the past has said this, but because one's pondering in the Quran has confirmed it. But if this pondering in the Quran says otherwise, then one should reject the traditional translation and interpretation no matter how famous or how great the translator or interpreter may be or no matter to whom it may have been attributed.

Regarding hadith one should adopt the policy that any hadith that is against the Quran; or that is against the Prophet's high character; or that is against the dignity of the companions – then that hadith cannot be from the Prophet (PBUH) and must be rejected. For an example of this, please see the traditional translation and interpretation of this very verse (80:1) that is in front of us, and that has been continuing for thousand years: (80:1-2) عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ – He frowned and turned away because the blind man approached him![Asad]. The interpretation says that "He" here refers to the Prophet (PBUH); that the Prophet (PBUH) is the one who frowned and turned away from that blind man: that the Prophet (PBUH) got irritated with the blind man be cause he interrupted the meeting he was having with the elites of Quresh in order to attract them to Islam. At this rude behavior of the Prophet (PBUH) towards that blind man Allah rebuked the Prophet (PBUH). But please

remember, I am talking here about the traditional interpretation. Let us continue this traditional translation of next verses: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ۝ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ۝ (80:3-4) – Yet for all thou didst know, [O Muhammad,] he might perhaps have grown in purity, or have been reminded [of the truth], and helped by this reminder. Again please remember Allah is telling the Prophet (PBUH) according to this traditional translation and interpretation: what do you know O Muhammad about this blind man who has come to you? He might be helped and grow in purity and morality; and you frowned at him and you turned away from him? أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝ (80:5-6) – Now as for him who believes himself to be self-sufficientto him didst thou give thy whole attention. That you, O Muhammad, are after these rich and influential elites of Quresh that they somehow could become Muslim? And when this poor and blind man came, you do not care about him; that you frowned and turned away from him? Do you see my friends, about whom these things are being said? The Quran did not name the person. But the interpretations say that it was the Prophet (PBUH) who frowned and turned away from the blind man; and that Allah then reprimanded the Prophet (PBUH) for his bad behavior. This is my friends, the traditional interpretation according to narrations and hadith.

The true reality of behind this event

My dear friends, please note again that the Quran did not name the person who frowned and turned away but the succeeding verses are in reference to that person. As I said: please ponder on the traditional translations. This does not require Socrates's mind. The high moral character of our Prophet (PBUH) is beyond such a reprehensible behavior. As I mentioned before, the chain of messengers and sending guidance started with Noah (PBUH) and ended with Prophet Muhammad (PBUH). In this entire chain if you look at the Quran the people who were the first ones to oppose the messengers

were the rich and the powerful and the people who were the first ones to accept the message were the poor and the downtrodden of the society. This happened without exception with every messenger of Allah.

The next point to note is that the rich and powerful elite always demanded from the messengers to drive away their poor followers because the rich objected to sit with them. And response of all the messengers to these elites was: Here the goal is equality and universal brotherhood of humankind, not power and wealth. Also, they told these elites that it is of no concern to us that what job one is doing but that with what level sincerity one is coming to this message and pondering on it with open mind and sincere heart; that everyone is equal in our eyes regardless of wealth, power, or status. The group that used to accept the message and join the messengers was mostly the poor people of the society, whereas the rich and powerful of the society mostly opposed them. This is what the Quran tells, and history proves it. Considering this, would the Prophet (PBUH) then be going after those rich and powerful Quresh at the expense of the poor? And if a poor blind person comes to him with all the sincerity of his heart, would the Prophet (PBUH) then drive him away? Would the Prophet (PBUH) frown at him? Please stop and think!

Point to ponder

First, this behavior of the Prophet (PBUH) as mentioned in the narration is against the entire teaching of the Quran; it is against the reason why the chain of messengers was sent to humanity of which Prophet Muhammad (PBUH) was the last chain. The Prophet's moral position was so exalted that to say that he did such an awful thing is clearly against the Quran. That is why one should ponder in the Quran which proclaims about him: وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4) – And thou (stands) on an exalted standard of character. [Asad]. One, who stands on such an exalted character, would never turn away

someone who comes to him with all the sincerity of his heart. This must now be clear in light of pondering in the Quran.

My dear friends, so, now, we have come to the point where we can understand the true meaning of the verses (80:1-2). The Quran did not say who it was who frowned and turned away. But one thing has now become in light of the pondering in the Quran: that it was *not* the Prophet (PBUH) who did this awful thing to the blind man. The question then is: Who was that person? Now, one needs to use concordance as the next step in this regard: Find out if there are other verses related to the topic at hand. This is what the Quran tells us to do in order to understand its meaning. Everyone has to do this oneself as ordered by the Quran – this is requirement for its pondering and understanding. Please make a note of this: making an independent effort is essential to understanding the Quran. I can only facilitate this journey for you. But you have to travel yourself. If you do that then you will be able to understand the Quran yourself. First, stop and ponder on what is traditional. Next, if you find it is against the Quran then it is your duty to find out what the Quran gives its meaning – and this is to be done according to concordance. Now, using this method let us focus on Surah *Al-Muddaththir* (المدثر), the 74th chapter of the Quran which w covered just few months back. This chapter tells especially how the influential leaders of the Quresh used to come and argue with the Prophet (PBUH); and used to offer in centives and were prepared to comprise with him. But this Surah tells how the Prophet (PBUH) would tell them that there is no question of compromise between truth and falsehood; that I am not going to listen to any of your conditions. The Quran says about the representative that the Quresh sent to the Prophet (PBUH): ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ۝ وَبَنِينَ شُهُودًا ۝ وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۝ (74:11-15) – Leave Me alone [to deal] with him whom I have created alone, and to whom I have granted resources vast, and children as (love's) witnesses, and to whose life I gave so wide a scope: and yet, he greedily desires that I give yet

more![Asad].These are the things this leader of Quresh was proud of. These Quresh were very proud of their superior status in Arab tribal hierarchy. They were also not that religious. So, what was the problem that they continuously kept on fighting the Prophet (PBUH) for 13 years in Mecca and 6 years in Medina? Did the Prophet (PBUH) stop them from idol worship? Did the Quresh wage battle against the Prophet (PBUH) for that reason? But it is the same Quresh that when it came to taking revenge they did not believe even their idols as illustrated by the story of *Dharar* who, when according to Quresh's tradition for taking revenge the priest threw the arrows at the idol and the answer came 'no', then threw the arrows at the idol and commented that if someone had killed your father then I would have seen how you could say 'no', and commented: Well, you can keep saying 'no' but I am going to take revenge for my father's murder. *This* was the extent of Quresh's religiosity?

The level of Arab's racial superiority

The biggest social status for Quresh was their racial superiority. First, they used to call all non-Arabs as '*Ajam* (dumb). This was their first thing that vanished by Prophet's message. Second, the next thing regarding social distinction was the color of the skin. They considered 'white' being superior and 'black', well, not worth anything. Then, among each other they had tribal hierarchy – and the Quresh occupied the highest level on this tribal pyramid. Normally, they would start a battle where individuals would fight one-on-one by introducing themselves. *Ansars* of Medina were mostly farmers and laborers. In the battle of *Badr*, when an Ansari came to fight a Qureshi then the Qureshi shot back at this insult and asked to be sent a Qureshi because to him the low Ansari was below his worth to fight. *This* was their level of racial superiority!

The other side of the coin

My dear friends, the Prophet (PBUH) gave the message of Islam

and whoever accepted it the Prophet (PBUH) embraced him: Bilal, the negro of Abyssinia; Suhaib, the laborer of Rome; Salman, the commoner of Persia. What a high place they occupied as the companions of the Prophet (PBH)! When asked who will lead your funeral prayer, Umar (R) replied: *Suhaib*, the laborer. Most of the companions of the Prophet (PBUH) were the freed slaves and migrants from different countries. There was no difference among them; all of them were equal companions in the eyes of the Prophet (PBUH). They were all part of one brotherhood of Islam. This is the other side. And the Quresh? They did not want even want to fight with non-Quresh! These are important things to take into account as context for understanding the verse at hand. Then, one would easily understand what really happened with the blind man.

Arrival of arrogant representative of Quresh to the Prophet (PBUH)

My dear friends, we were talking about how a representative of Quresh came to the Prophet (PBUH) in a very arrogant mood and presented his conditions for compromise. The Quran says that his tribe was big and wealthy and powerful. And because of this, his behavior was very arrogant. He was extremely opposed to the message of the Prophet (PBUH): كَلَّآ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ لِـَٔايَٰتِنَا عَنِيدًا ﴿ (74:16) – Nay, verily, it is against Our messages that he knowingly, stubbornly sets himself.[Asad].

When we were discussing this Surah few months ago I mentioned then how the Quran painted a dramatic picture of this episode. Whatever the Prophet (PBUH) said he pondered: إِنَّهُۥ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿ (74:18) – Behold, (when Our messages are conveyed to one who is bent on denying the truth,) he reflects and meditates (as to how to disprove them).فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿(74:19) – and thus he destroys himself, the way he meditates.[Asad]. How wrong was his decision that he arrived at after meditating and pondering again: ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿ (74:20). The Quran says at other places that elites like him wanted the poor (who

had accepted the message) to be driven away. The Quran says how wrong this conclusion he arrived at was even after second thought: ثُمَّ نَظَرَ (74:21). Now, consider this: The verse (80:1) under discussion starts with the word *'Abasa*(عَبَسَ) – he frowned. The Quran does not say 'who' frowned? But look at the verse (7422)? It uses exactly the same word *'Abasa*(عَبَسَ) regarding the elite representative of Quresh: ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (74:22) – and then he frowns and glares. ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ (74:23) – and in the end he turns his back [on Our message], and glories in his arrogance. [Asad].

The Quran's explanation of *'Abasa-wa-Tawalla*(عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ)

My dear friends, did you notice that the same word *'Abasa*(عَبَسَ)the Quran has used here in verse (80:1) as it has in verse (74:22)? And verse (74:22) refers to the elite representative of the Quresh who frowned in arrogance and turned away. Let me please emphasize again, my friends, the principle of understanding the Quran: first, stop and ponder on what is traditional. If, what is going on in the name of Islam is against the Quran, then it becomes one's duty to find out from the Quran what *it* says about of this issue – and its method is concordance, or cross-referencing with verses of the Quran on the same topic. You saw an example of this that I presented earlier and the matter became quite clear as to who frowned and who turned away? The next thing is to find out from the Quran what these elites were saying? What right do I have to say anything from my side? I have spent a better part of my life to ponder in the Quran – according to the method which the Quran itself has recommended.

Please listen to what these elites were saying: First, they used to look down upon and despise the poor and downtrodden people. They used to say about them with contempt: أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا (6:53) – "Is it these then that Allah hath favored from amongst us?"[Asad]. My dear friends, you can very well imagine what kind of people these elites were! Their argument was not about any principle. They were sarcastically and tauntingly saying: "These are the people on

whom Allah has done His favors? Couldn't He find any other people to shower His favors!?" What were these elites demanding? In surah Hud and surah Yunus Allah warns his messengers not to compromise with these influential elites. In surah Al-An'aamquoted above (6:53) just one verse before it is said: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (6:52) – Hence, repulse not (any of) those who at morn and evening invoke their Sustainer, seeking His countenance. It is clear from this verse what these elites wanted from the messengers. They wanted to compromise provided these poor and downtrodden who had sincerely accepted Islam were driven out.

Advancing universal brotherhood of humankind *is* the advancement of *Deen*

My dear friends, the Quran made it absolutely clear about influential elites joining this new movement. They are generally not interested in advancing universal values (i.e., Islam). We know from history that it is the poor people who first say yes to the messengers with all the sincerity of their hearts. The Prophet (PBUH), obviously, wanted Islam to spread fast. But the Quran made it absolutely clear that no matter how much benefit may seem to come from influential people joining Islam but it must not be at the expense of the poor. Rationalizations such as that rich influential people will bring glory to Islam are nothing but self-deception. The basis of Islam is universal brotherhood of humankind. If one wants to bring glory to Islam at the expense of this universal basis then *Deen* is already gone. Islam does not need quantity but quality – sincerity of hearts and minds. Again, the verse quoted earlier clarifies this point: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (6:52) – Hence, repulse not [any of] those who at morn and evening invoke their Sustainer, seeking His countenance. Thou art in no wise accountable for them-just as they are in no wise accountable for thee -and thou hast therefore no right to repulse them: for then thou

wouldst be among the evildoers.[Asad]. What jobs the poor were doing should be of no concern to Islam no matter how much the rich and influential of the society make this their concern; no matter how much the influential chieftains – who supposedly wanted to bring glory to Islam – kept account (حِسَابِهِمْ) of what "low level menial" jobs the poor were engaged in and wanted them driven away? But you must not drive away these poor who have come to Islam with complete sincerity, otherwise you will become among the evildoers (مِنَ الظّٰلِمِيْنَ). *This* was told to every messenger from Noah (PBUH) to Prophet Muhammad (PBUH) by the Quran.

My dear friends, please keep pondering at every step how the Quran keeps on refuting the "HE" which is normally associated with the Prophet (PBUH) in the traditional interpretation of (80:1-2) – عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ He frowned and turned away because the blind man approached him![Asad]. Do you think that after these clear instructions the Prophet (PBUH) would have turned away the blind man who had so sincerely accepted Islam? Please note down one more reference: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (18:28) – And contain thyself in patience by the side of all who at morn and at evening invoke their Sustainer, seeking His countenance, and let not thine eyes pass beyond them in quest of the beauties of this world's life; and pay no heed to any whose heart We have rendered heedless of all remembrance of Us because he had always followed (only) his own desires, abandoning all that is good and true.[Asad]. This is what the Quran kept on emphasizing to the Prophet (PBUH).

Quranic meaning becomes clear only by using concordance

My dear friends, please note down another reference on this topic: لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (15:88) – (so) turn, not thine eyes (longingly) towards the worldly benefits which We have granted unto some of those (that deny the truth). And

neither grieve over those (who refuse to heed thee), but spread the wings of thy tenderness over the believers [Asad]. The rich must have been offering money and influence to the Prophet (PBUH) and arguing that their support will strengthen his movement. But the Prophet (PBUH) was told not to accept such offers that come with strings attached, but, instead, focus your energy on the poor and to shelter them under your caring and loving wings. This topic has come at many places in the Quran. I have only given few references. You see how the matter becomes quite clear by using concordance. In the verse quoted earlier (74:22) the word *'Abasa* (عَبَسَ) itself has come that shows it were the Quresh (or their representative) who frowned. The Quresh usually used to discuss various issues (of contention) with the Prophet (PBUH) and he used to try that somehow they could see the light; that somehow they could come to the right path. So, these things used to go on. But the Quran also tells that these Quresh used to despise and look down upon poor people.

Using concordance we have arrived at a point where we can now see the backdrop for the verses (80:1-2). While a representative of Quresh was sitting with the Prophet (PBUH) discussing and arguing with him then a blind man came. First, please note that it was not some royal meeting with big leaders that no one, especially a poor person, was not allowed to come. It was open to anyone and a blind man did come to the Prophet (PBUH) – أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰى ۚ.

Who frowned?

My dear friends, in Arabic, أعْمَى means blind man – i.e., one who is deprived of vision. But it also means one who is deprived of wealth. This means the person who came to the Prophet (PBUH) was blind as well as poor. First, being poor is one thing. But on top of that being blind is quite another. This adds to helplessness. Therefore, this kind of person should be, in fact, worthy of empathy and should be treated with respect. And, it should not matter who he was. The person who frowned must be then that rich and powerful

person who frowned must be then that rich and powerful representative of the Quresh – who was sent by the Quresh to discuss some issue with Prophet. He saw that this poor blind man was not one of his tribal leaders. So he frowned. Even in our society poor and blind are looked down upon. But you can very well imagine what the level of hatred any Quresh would have for a blind poor man. There is no need of identifying any names here to understand the pointof the Quran. Who the blind man was or who the person who frowned was should be of no concern here? It is the principle that matters, not the names. What is the point of being curious to know the names anyway? Also, the means of doing this are only thorough narrations. But if one goes to narration then it tells that the person who frowned was the Prophet (PBUH). Please remember, the Quran is forever. Its teachings are forever. Its guidance is forever. Its principles are forever. Its teaching does not depend on time, event, place, or circumstance.

The Holy Quran is not a book of history that it should tell such and such events occurred on such and such dates in such and such places and that so and so were involved. These happen in books of history. The Quran gives principles of life. It provides the life system of *Deen* as a foundation of society based on universal brotherhood of humankind. But that was (and still is) the problem with rich influential leaders. They cannot tolerate poor sitting by their side. That is why it is said: اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (80:2). The very next says: وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى (80:3). The traditional translation: Yet for all thou didst know, [O Muhammad,] he might perhaps have grown in purity. [Asad]. But this translation assumes that it was the Prophet (PBUH) who frowned and Allah is admonishing him for that. But, as we have discussed, it was unbecoming of the Prophet (PBUH) to frown at a poor blind man. So, this revelation was being directed through the Prophet (PBUH) to whoever it was who frowned at the blind man: how do you know that this blind man cannot become a

virtuous man whose personality would be nourishedand developed by following Allah's code of guidance? Or, unlike you – أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ (80:4) – he has been reminded (of the truth), and helped by this reminder?

There are two things that have become clear from the teachings of the Quran: 1) if one can truly understand the meaning through conscious and deliberate effort using the methodology suggested by the Quran then it is very beneficial. And 2) if one acts on it and implements it in life then one's character develops. This is more important than even the first one. This message of revelation is being conveyed to the representative of the Quresh via the Prophet (PBUH) that you, who frowned and despised this poor blind man, maybe, he will be benefited from the teachings of the Quran more than you because of his sincerity and dedication to the mission of the Prophet (PBUH). And: (80:5-6) أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ — Now as for him who believes himself to be self-sufficientto him didst thou give thy whole attention.[Asad]. The representative of the Quresh wants the Prophet (PBUH) to focus his attention on the rich and the powerful who consider themselves to be self-sufficient – and ignore the poor no matter how sincere in their belief they may be. This is clear in light of the concordance that we saw earlier. Further: وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ (80:7) – although thou art not accountable for his failure to attain to purity.[Asad]. Those who consider themselves self-sufficient and do not listen – they are responsible for their own behavior. It is not that you, O Prophet (PBUH), did not give them the message. But they consider themselves self-sufficient and superior and, so, they are not interested to pay attention to this message. So, you are not responsible for them. These leaders of Quresh are responsible for their condition themselves.(80:8-10) وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ – but as for him who came unto thee full of eagerness and in awe [of God] him didst thou disregard![Asad]. You want me to disregard this poor blind man?

No, it is not going to happen.كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (80:11) – Nay, verily, these (messages) are but a reminder.

This word "كَلَّآ" (*Kallaa*) means an emphatic "No". What the Quresh want will never happen because – كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (80:11) – the Quran is an open code of life for all humankind. There is no question of any discrimination in it of any type. Whoever wants to heed its advice is welcome. Status, fame, fortune, power, elitism, etc. do not play any part in it. The poor cannot be turned away from it because the rich and powerful despise them. No coercion or force can be used against anyone in it. Everyone is judged purely on the basis of sincerity of hearts and purity of character. That will be only way to benefit from it. Who knows how many pearls are hidden in the human dust. The Quran has profusely praised the Prophet (PBUH) and companions:

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29) – MUHAMMAD is God's Apostle; and those who are [truly] with him are firm and unyielding towards all deniers of the truth, [yet] full of mercy towards one another.[Asad].

From this one can see what level of high moral position the Prophet (PBUH) and his companions occupied in the eyes of Allah. When the Prophet (PBUH) raised his call for Islam it were mostly the poor and downtrodden of the society who initially responded to his call while the rich merchants, slave owners, and leaders of Quresh abhorred it. They kept asking the Prophet (PBUH) to compromise and, as mentioned earlier, the Quran repeatedly advised the Prophet (PBUH) not to compromise on the fundamental principle of equality and brotherhood of all humankind. It was under this backdrop that they sent their representative to the Prophet (PBUH) to argue their case when the poor blind man came and the Quresh's representative frowned at the blind man proclaiming that the poor are despicable and disposable; and that he cannot sit with alongside the poor? Well, what does he know?

The poor, the weak, and the downtrodden ones, you so despise;
Many among them, don't youknow mayturn out be the jockeys?

And when I listen to this poem of Iqbal (1877-1938) then, leave aside the meaning, I become rapturous just by reciting it:

For a long, very long period, in idol temples and in Kaaba, Life cries out;
Only then a wise one, author of secret, from the school of love, comes out!

This precious treasure does not come easy. Poet Mir (1721-1810) puts it this way:

Do not think it is easy; the skies have been turning for years;
Only then from its curtain of dust does a man come in years!

My dear friends, what I can say about men who came from under these sands of Arabia. The sad aspect of it is that the real history of these men never came out. It is these dusty Bedouin people who created the biggest revolution the world has ever seen and it is these people whom the Quresh despised. These were the poor working class people – some from Abyssinia, some from Persia, some from Rome – the wise ones, authors of secret who came from the school of love of the Prophet (PBUH). What a great literary style it is when the Quran talks about that representative who came to the Prophet (PBUH) on behalf of the Quresh: What do you know about these people whom you despise so much because they are poor? The Prophet (PBUH) was told to convey the message to Quresh: You are drowned in your arrogance of wealth, you are intoxicated with hubris of being superior race – how could you know what a human being is? How could you know what his real value is? You are saying that I should ignore this poor blind human and, instead, pay attention to you because you are wealthy? What a hubris? This is coming little later where the Quran cuts the very root of racial superiority. Here in verse (80:11) it is said that the Quran is a

reminder until the Day of Judgment for human beings فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ (80:12) – and so, whoever is willing may remember Him. And for those who think of themselves self-sufficient and do not want any reminders – you are saying that I should go after them?

Is there any doubt even now?

My dear friends, even these few verses that have been presented – if one ponders over them then it is easy to understand this episode that happened with the blind man. This is according to overall teaching of the Quran; this according to the high moral position of the Prophet (PBUH); this is according to the respectable position of the companions. There is no chance of any doubt; there is no question of any criticism; there is no possibility of any complications; there is no need of any narration; there is no need of knowing any names. The goal of the Quran is open and clear: فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ (80:12) – and so, whoever is willing may remember Him. The Quran has unique style. Even if some side issues come into picture the Quran clears the matter.

Deep conspiracy against the Quran

Whatever conspiracies and doubts that were created against the Quran one of them was that the Quran was not compiled during the Prophet's time. It was the duty of the Prophet (PBUH) to give the Quran to the *Ummah*. Allah has said that Quran's compilation and its protection is Our duty. The duty of the last messenger was to make sure it written, compiled, and protected. It is mentioned in the Quran that there were respected scribes to write down the Quran. History tells that there used to be kept a Master copy of the Quran under the main pulpit of Prophet's mosque. The Quran says that it was written down on strong parchment not on paper or on leaves. Those days it was the best way to protect important written documents. After the Prophet (PBUH) would recite and dictate the revelation to the scribes he would ask several of his companions to proofread it and recite it to him. After he was fully sure of the

accuracy he would keep a Master piece under the pulpit of his mosque. Thousands of copies used to be made from the Master piece. It is said that the Prophet (PBUH) instructed his followers not to carry the Quran while traveling to different countries for fear of desecration of the Holy Book. This means copies of the Quran were available during the Prophet's life itself.

The holy Quran is a written and complied book. In Arabic language the word كتاب (*Kitaab*) is only called a book when its page are put and bound together. Binding those days was done using metal rings through the pages. The very first words of the Quran are: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ (2:2) – This is the Scripture whereof there is no doubt. [Pickthall]. However, conspiracies were hatched to create doubt in this Book: that it was not compiled for many years; that it was written on bones and leaves of date trees. And May Allah protect us from that hadith which says that two verses of the Quran written on date tree leaves dealing with رجم (*Rajam* i.e., stoning to death) were eaten by a goat and disappeared permanently. So much conspiracy was hatched against the Quran?

My dear friends, all these are present in our so-called sacred books of hadith and interpretation. *This* has become the status of the Quran? So much doubt has been sowed in the Quran by Jews, Christians, and Muslims but, in fact, hypocrites. So many narrations and hadith abound about the compilation of the Quran that some say that it was collected and complied during the period of Abu Bakr (R); some say that it was done during the period of Umar (R); and still some say that it was collected during the period of Uthman (R) so much so that he is known as *the* collector of the Quran. And, to increase further doubt, it is mentioned in hadith that there remained errors in the Quran compiled by Uthman (R); and when he was informed about it he said that people will correct themselves?! This is what is happening with the Book of Allah whereas the Quran says: (80:12-14) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ – and so, whoever

whoever is willing may remember Him in (the light of His) revelations blest with dignity ,lofty and pure. [Asad]. Allah-u-Akbar! The Quran is inside of صحیفہ (*Sahifah*) – meaning it is written and complied. It is blessed with dignity. It is lofty and unadulterated. And further: (80:15-16) بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ – [borne] by the hands of messengers noble and most virtuous. The Quran is recorded by those who are most respected and dignified having spotless character. سَفَرَةٍ (*Safrah*) means clear spotless whiteness.And كِرَامٍ (*Kiraam*) means every kind of dignity and virtue and loftiness that is completely free and independent of any bias and corruption. These are the people who recorded the Quran – who had highest moral character, who were most honest and dignified and free from any corruption – under the supervision of the Prophet (PBUH). These are the lofty attributes that Allah has mentioned about the scribes who recorded the Quran. And the Quran itself says that its recording; its compilation; and its protection – all these are Allah's responsibilities. This, my friends, is the ultimate proof from the Quran itself that it does not need any outside rationale for its explanation. (*Kiraam*) means every kind of dignity and virtue and loftiness that is completely free and independent of any bias and corruption. These are the people who recorded the Quran – who had highest moral character, who were most honest and dignified and free from any corruption – under the supervision of the Prophet (PBUH). These are the lofty attributes that Allah has mentioned about the scribes who recorded the Quran. And the Quran itself says that its recording; its compilation; and its protection – all these are Allah's responsibilities. This, my friends, is the ultimate proof from the Quran itself that it does not need any outside rationale for its explanation.

My dear friends, we completed today up to verse 16 of Surah *'Abasa*(عَبَسَ). We will continue from verse 17 in our next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
8

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
web:www.toluislam.com

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں